Phone : 80814

قرآنی نظامِ رُبوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کنونشن نمبر   مئی و جون 1963ء

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ڈیڑھ روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

کنونشن نمبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ

جلد ۱۵ — نمبر ۵-۶

مئی-جون ۱۹۶۳ء

ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۱۴
خط وکتابت کا پتہ
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵-بی-گلبرگ
لاہور

بدلِ اشتراک
ہند و پاکستان سے
سالانہ ۸ روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ۱۲ شلنگ
اس پرچہ کی قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے

فہرستِ مضامین

۱ — لمعات — ۳

۲ — روئیدادِ کنونشن — (محترم ابو العاکف صاحب) ۹

۳ — استقبالیہ — (میاں عبدالخالق صاحب) ۴۱

۴ — رپورٹ — (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام) ۴۷

۵ — طلوعِ اسلام اور اس کی دعوتِ انقلاب — شیخ محمد شفیع صاحب ۵۳

۶ — نقد ونظر — ۶۲

۷ — قیامت موجود — (محترم پرویز صاحب) — ۶۵

۸ — سفر یا آوارگی — (راجہ محمد اکرم ایڈوکیٹ) ۸۹

۹ — طلبار کے مسائل — (مذاکرہ کنونشن کے خطابات) ۹۷

(۱) بزرگوں پر عدم اعتماد (محترم میر غضنفر صاحب) ۹۸

(۲) استاد اور طالبعلم کا باہمی رشتہ (محترمہ ریحانہ داؤد) ۱۰۲

(۳) طلبا کی معاشی مشکلات اور ان کا حل (محترم جاوید رحیم) ۱۰۹

(۴) طلبا اور پاکستان — (محترمہ نسیم عالم زیب) ۱۱۴

(۵) تعلیم کا مقصد (پروفیسر زاہد منظور صاحب) ۱۲۱

(۶) طلبا اور مذہب (پروفیسر شمیم انور صاحب) ۱۲۵

(۷) ہمارے نوجوانوں کے مسائل (مرزا محمد کفیل صاحب) ۱۳۸

(۸) بچوں کی تربیت گاہ (محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ) ۱۴۲

۱۰ — خلافت کمیٹی ۱۴۵

۱۱ — رابطہ باہمی (معہ مرزدی علامت) ۱۵۷

میری بیٹی ـــ طاہرہ!

میں نیپئر بیرکس، کراچی میں رہتا تھا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میرے ہفتہ واری درسِ قرآن کریم کا سلسلہ نیا نیا شروع ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بچی نہایت التزام سے درس میں شریک ہوتی ہے۔ دیکھنے میں دُبلی پتلی، کمزور سی لیکن چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں بلا کی تیزی اور تیزی کے ساتھ ایک عجیب انداز کی متانت۔ وہ سامنے چلتی تو بھی نگاہیں کتاب پر، اور درس کے شروع ہونے میں وقت ہوتا تو بھی مصروفِ مطالعہ۔ درس کے دوران میں اپنی کاپی پر مسلسل نوٹس لکھتی رہتی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی ـــ باباجی! کچھ باتیں وضاحت طلب رہ جاتی ہیں۔ میں نے کہا بیٹی! تم فرصت کے وقت آکر سمجھ لیا کرو۔ اس نے فرصت کے اوقات میں آنا شروع کیا۔ اور میں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ جس بیٹی کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی وہ مل گئی۔ یہ میری قرآنی فکر کی وارث ہو سکتی ہے۔ چند دنوں میں وہ ہمارے گھر میں یوں گھل مل گئی گویا وہ یہیں پیدا ہوئی تھی ـــ قرآن کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ یہ تھی میری سب سے پہلی طاہرہ بیٹی۔ اس کا نام ہی طاہرہ تھا۔ میں نے اسے برسوں پڑھایا۔ پھر میرے ہاتھوں نے اسے بیگم کشفی بنایا اور اس کے بعد وہ طلوعِ اسلام کے صفحات پر امِ عاکف کے نام سے متعارف ہوئی۔ (خدا عاکف کو سلامت رکھے) اب وہ انتظار میں تھی کہ جس قرآنی درسگاہ کا تصور میرے ذہن میں ہے وہ وجود میں آ جائے تو وہ اس کے ایک شعبہ کو سنبھال کر بیٹھ جائے اور یوں (بقول اس کے) اپنے بابا کی سچی بیٹی بن کر دکھائے۔

وسط اپریل میں طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن میں، درسگاہ کی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے پہلا قدم اٹھایا گیا۔ کشفی صاحب اس خوشخبری کو لے کر کراچی واپس گئے۔ مجھے اطلاع ملی کہ طاہرہ بیٹی معہ اپنے تینوں بچوں کے ۲؍جون کو لاہور پہنچ رہی ہیں۔ اس کے آنے کی خبر سے میرے گھر میں ایک عجیب قسم کی جگمگاہٹ پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

ہم ۲؍جون کے انتظار میں تھے کہ ۲۳؍اپریل کی دوپہر، کراچی سے ٹرنک کال آیا کہ

طاہرہ مع دو بچوں کے ٹرک کے حادثہ میں انتقال کر گئی ـــ

طاہرہ انتقال کر گئی؟ حادثہ میں؟ دو بچوں سمیت؟ ـــ خبر جھوٹی ہے۔ میرا دل مجھے فریب دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن فریب کب تک چل سکتا تھا، خبر سچی تھی۔ طاہرہ چلی گئی ـــ ۲؍جون سے پہلے! درسگاہ بننے سے بہت پہلے!!

بجلیو! اور بھی کاشانے تھے ـــ کیوں یہ اجڑا ہوا گھر یاد آیا!

طاہرہ بیٹی! تم نے یوں چلے جانا تھا تو اپنے بابا کے پاس آئی ہی کیوں تھی؟ عمر یوں بھی تو گزر ہی جاتی لیکن اب

یہ کیسے گزرے گی؟ طاہرہ! ——— لیکن نہیں۔ مجھے کچھ نہیں کہنا چاہیئے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے قرآنی احباب کی طرف سے مجھے بے شمار پیغاماتِ تعزیت موصول ہوئے ہیں میں ان کی غمگساری کے لئے شکرگزار ہوں۔ انہیں فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے مشکل ہے وہ میری معذرت قبول فرمائیں۔ ویسے بھی طاہرہ، کچھ تنہا میری بیٹی تھوڑی تھی۔ وہ قرآنی احباب کی مشترکہ طاہرہ بیٹی تھی ——— اس لئے میرا رونا نہیں، رونا ہے سارے گلستاں کا۔

سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کون، کس کے آنسو پونچھے! جگر نگار ——— پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سورۂ ھود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ واتخذتموہ وراءکم ظہریا (۱۱/۹۲)۔ عام معنی تو اس کے یہی ہیں کہ تم نے خدا کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ لیکن اس میں لفظ ظہریا (۱۱/۹۲) کا استعمال ایک بڑی گہری حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ ظہریؔ اس فالتو اونٹ کو کہتے ہیں جو سفر میں احتیاطاً ساتھ رکھ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی اونٹ کو کوئی حادثہ ہو جائے تو اس وقت اس سے کام لیا جا سکے۔ یعنی اس اونٹ کی حیثیت مقدم نہیں ہوتی بلکہ ثانوی ہوتی ہے کہ وہ عند الضرورت کام میں آ سکے۔ آج کل کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اس کی حیثیت کرکٹ کی ٹیم میں (EXTRA) کی سی ہوتی ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ تمہارے نزدیک اہمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں اور خود ساختہ قوانین و تدابیر کو حاصل ہے لیکن تم نے خدا کو محض بطور (EXTRA) ساتھ رکھ چھوڑا ہے کہ جب تمام حربے ختم ہو جائیں اور کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہو تو اس سے کام لیا جائے اور جب کام نکل جائے تو پھر اسے الگ ہٹا دیا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ مذہبی فریب انگیزی کی یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن ایک لفظ میں اس خوبصورتی سے بیان کر گیا ہے۔ اس پر غور کیجئے اور پھر ذرا چھلتی ہوئی نگاہ ڈالئے اپنے دور کے مفاد پرست خدا پرستوں پر۔ آپ کو صاف نظر آ جائے گا کہ خدا کو کس طرح ظہری بنایا جا رہا ہے۔ ایک پولیٹکل لیڈر کے لئے (مثلاً) صداقتی نظام زیادہ سازگار ہے۔ اس کی مصلحتیں اس کے حق میں ہیں۔ وہ اس کی تائید میں مختلف دلائل دیتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ان سے کام نہیں چلتا تو وہ جھٹ ظہریہ کو سامنے لاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ صداقتی نظام منشائے اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس

دوسرا پارلیمنٹری نظام میں اپنی مصلحت دیکھتا ہے۔ وہ اپنے دلائل کے ترکش کے تمام تیر اس کے حق میں چلا دیتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کارگر نہیں ہوا تو وہ اس نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتا ہے یا مثلاً، کسی لیڈر کی ایک وقت کی مفاد پرستیوں کا تقاضا ہے کہ جائداد۔ دولت وغیرہ کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی عائد نہ کی جائے۔ وہ سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیتا ہے کہ اسلام کی رُو سے ذاتی املاک پر حد بندی عائد کرنا قطعاً جائز نہیں۔ دوسرے وقت میں جب اس کی مصلحتوں کا تقاضا اس کے خلاف ہوتا ہے تو وہ شور مچا دیتا ہے کہ ملک کی دولت دو سو خاندانوں میں محدود ہو رہی ہے اسے روکنا چاہیئے۔ دولت کا چند افراد یا گھرانوں میں جمع ہو جانا بالکل خلافِ اسلام ہے۔ یا (مثلاً) ایک وقت میں وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کی اکثریت فریق مخالف کے ساتھ ہے اور وہ (فریق مخالف) جمہوریت کے اصول کی بنا پر باری لے جائے گا تو یہ اپنی ساری طاقت یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیتا ہے کہ اکثریت حق و صداقت کا معیار نہیں بن سکتی۔ ایسا تصور اسلام کے یکسر خلاف ہے لیکن جب وہ اپنے اندازے کے مطابق سمجھتا ہے کہ عوام اس کے ساتھ ہیں تو وہ جمہوریت کو عین اسلام بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ جمہوری نظام نہ رہے تو اسلام کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مختلف لوگوں اور پارٹیوں نے کس طرح خدا (اسلام) کو بطور ظہیر اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے اور اسے اپنی مصلحتوں کے لئے کس کس انداز سے کام میں لایا جا رہا ہے۔ اس قسم کی ایک بہت بڑی مثال حال ہی میں سامنے آئی ہے جو بڑی غور طلب بھی ہے اور افسوسناک اور مضحکہ انگیز بھی۔

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں دو آراء ہو نہیں سکتیں کہ اسلام میں ملوکیت حرام ہے وہ اسے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اس نے اسے مٹا کر بتا دیا۔ اس کے بعد ملوکیت پھر مسلمانوں میں رائج ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود یہ تصور مسلمانوں میں مسلسل قائم رہا کہ ملوکیت، اسلام میں جائز نہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں واقعۂ کربلا کو جو اس قدر اہمیت حاصل ہے تو اسی نظریہ کے ماتحت کہ یزید سے ملوکیت کی ابتدا ہوئی تھی اور امام حسینؓ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

یزید کے زمانے سے لے کر اس وقت تک جس ملک میں بھی مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اس کا انداز ملوکیت ہی رہا۔ اس وقت اس المیہ کے لئے صفِ ماتم بچھانا ہمارے پیشِ نظر نہیں کہ جو چیز اسلام کی اصل و بنیاد کے خلاف تھی مسلمانوں نے اسے کس طرح تیرہ سو سال تک مسلسل اور متواتر جاری رکھا اور ستم ظریفی یہ کہ اس کے ساتھ ہی حادثۂ کربلا کی یاد کو بھی برابر قائم رکھا۔ اب ہمارے زمانے میں خدا کے کائناتی قانون نے جو زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتا ہے، وہ لے ملوکیت کی لعنت کو مٹانا شروع کیا تو مسلمانوں کی حکومتوں میں بھی ملوکیت کا تختہ الٹنے لگا۔ لیکن ابھی تک ان میں بعض مقامات پر ملوکیت بدستور موجود ہے۔ یہ موجود تو ہے لیکن زمانے کے تقاضوں کے سامنے لرزہ براندام اور رعشہ بدست۔ یہ حکومتیں اپنی حفاظت اور بقا کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہی ہیں۔ لیکن انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ ان میں سے کوئی حربہ بھی اب کارگر نہیں ہو سکتا۔ جب حالت یہاں تک پہنچ چکی تو انہیں "ظہیر" کا خیال آیا۔ چنانچہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ۔

"سعودی عرب کے ولی عہد امیر فیصل نے ـــــ جو وہاں کے وزیر اعظم بھی ہیں، حاجیوں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ قرآن ہمارا آئین ہے اور ہم باطل کے ہر تخریبی پراپیگنڈہ کے خلاف جہاد کریں گے۔ (پاکستان ٹائمز ۴ مئی ۶۳ء)

اللہ اکبر! ملوکیت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ خود ولی عہد۔ کعبہ میں کھڑا ہو کر لاکھوں حاجیوں سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ

قرآن ہمارا آئین ہے۔

آپ نے دیکھا کہ "قرآن کے ظہیر" کو کس مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے؟ اے کاش! ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی کہ اب ملوکیت، ان تعویذوں سے بچ نہیں سکتی۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں۔ اس کا فیصلہ ہے کہ لوگوں کو ان قوانین کے سامنے طوعاً اور کرہاً جھکنا پڑے گا۔ جو لوگ طوعاً نہیں جھکیں گے زمانے کے تقاضے انہیں کرہاً جھکا دینگے۔ جی چاہتا تھا کہ یہ لوگ قوانین خداوندی کے سامنے طوعاً جھک جاتے تاکہ کرہاً جھکنے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی اور تباہیاں آتی ہیں خلق خدا ان سے محفوظ رہ جاتی۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ کرہاً جھکنے سے سب بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب باطل کا نظام زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو حق کا نظام ساتھ کے ساتھ اس کی جگہ نہیں لے لیتا اس سے ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے ایک اور غلط نظام پُر کرتا ہے۔ اس غلط نظام کی جگہ نظام حق و صداقت کے آنے میں پھر وقت لگ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی قدیم مستحکم۔ باطل نظام کا جڑ بنیاد سے اکھڑ جانا بجائے خود ایک اچھی علامت ہوتی ہے لیکن محض اتنے سے قرآن کا منشا پورا نہیں ہوتا، اور انسانیت ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی جو اسے نظام خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو قومیں اس وقت مسلمانوں کے ملکوں سے ملوکیت ختم کرنے کے درپے ہیں وہ بھی اس کی جگہ قرآنی نظام قائم نہیں کر رہیں۔ انہیں قرآنی نظام تک آنے کے لئے ابھی اور مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ سعودی عرب کے ولی عہد امیر فیصل نے اعلان کیا ہے کہ ان کی مملکت کا آئین قرآن ہے۔ ہمیں امیر فیصل پر کوئی گلہ نہیں۔ جن لوگوں کی بادشاہت خطرے میں ہو وہ اس کے تحفظ کے لئے ہر حربہ اختیار کریں گے لیکن ہمیں افسوس اس بات کا ہے ـــــ اور افسوس ہی نہیں بے حد صدمہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان تمام اسلامی ممالک سے آنے والے لاکھوں حاجیوں کے اجتماع میں کیا اور ان میں سے کسی ایک میں اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ کہتا کہ آپ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لئے جو جی میں آئے کہئے اور کیجئے لیکن خدا کے لئے قرآن کو بدنام نہ کیجئے۔ دیگر اسلامی ممالک کے کس قسم کے لوگ اس اجتماع میں موجود تھے اس کا تو ہمیں علم نہیں کم از کم پاکستانیوں میں سے ایسے لوگ وہاں موجود تھے جو اقامت دین (حکومت خداوندی) کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں۔ جو جمہوریت کو اسلام کا بنیادی ستون بتلاتے ہیں اور اس کے

قیام کے لئے یہاں متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ جن کی حمیتِ دینی کا یہ عالم ہے کہ اگر حکومت نکاح کے لئے بلوغت کی شرط عائد کرتی ہے تو وہ اس "خلافِ شریعت" قانون کی تنسیخ کے لئے جانیں تک لڑا دینے کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ حضرات وہاں موجود تھے۔ لیکن کیا مجال جو امیر فیصل کے اس اعلان کے خلاف ایک حرف بھی زبان تک لائے ہوں ۔۔۔ اور جب یہ لوگ واپس آئیں گے تو محرم کی مجلسوں میں یزید کی ولی عہدی اور بنی امیہ کی ملوکیت کے خلاف دھواں دھار تقریریں کریں گے اور شہادت کا عظیم الشان فلسفہ بیان کر کے ثابت کریں گے کہ جو قدم ملوکیت کو مٹانے کے لئے اٹھے وہ انسان کو کس طرح حیاتِ جاوداں کا مستحق بنا دیتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان ان کی زبان حقیقت ترجمان سے یہ کچھ سنیں گے اور ان کے جوشِ ایمان پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائیں گے۔

اور یہ بھی ان کا "نظریہ" ہی ہوگا

---

(۳)

طلوعِ اسلام کی ساتویں سالانہ کنونشن (۳ سے ۷ اپریل) میں بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس مرتبہ کھلے اجلاس کی تعداد زیادہ تھی۔ اربابِ فکر و نظر نے جس ذوق و شوق سے جوق در جوق ان اجلاس میں شرکت کی اور جس جذب و انہماک سے تقاریر کو سنا اس سے واضح ہوتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ، قرآنی فکر کی تحریک دن بہ دن آگے بڑھتی اور چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ وقت ہماری تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نظریاتِ زندگی کو آزما کر ان سے تنگ آچکی ہے۔ اور ایک نئے راستے کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھر رہی ہے۔ یہ راستہ جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے، قرآن کریم کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے؟ لیکن دنیا اپنے ناکام تجارب سے تنگ آکر اب چاہتی یہ ہے کہ وہ ایسا نظریۂ زندگی اختیار کرے جو اپنے عملی نتائج سے اپنی صداقت کی شہادت پیش کرے۔ پاکستان کو اسی نظریۂ حیات کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اگر یہاں قرآنی نظام قائم ہو جائے تو آپ دیکھئے کہ "یدخلون فی دین اللہ افواجاً" کا حسین نگاہ منظر کس طرح چند دنوں میں سامنے آجاتا ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کے سامنے یہی مقصد ہے۔ پھر جس طرح یہ مقصد عام دنیاوی مقاصد سے الگ ہے اسی طرح یہ تحریک بھی دوسری تحریکوں سے جداگانہ ہے۔ اس میں شامل ہونے والوں کے سامنے کوئی دنیاوی مفاد نہیں ہوتا۔ ان کے لئے دینا ہی دینا ہے۔ کچھ لینا نہیں۔ کاشت کرنا ان کے ذمے ہے۔ فصل، عام انسانیت کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریک میں وہی لوگ شامل ہوں گے جو بلند مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہوں، اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود جن کا مقصد زندگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک نہ عوامی تحریکوں کی طرح پھیلتی ہے نہ ہنگامی تحریکوں کی طرح فضا میں شور مچاتی ہے۔ یہ نہایت خاموشی سے قرآنی نظریۂ زندگی کو عام کئے جا رہی ہے۔

اور اس کے نتائج بڑے حوصلہ زا اور اُمید افزا ہیں۔

آئیندہ صفحات میں کنونشن کی روئداد آپ کے سامنے آئے گی۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک ایک قدم پر ——— کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست" لیکن بعض مقامات اس میں ایسے آئیں گے جو آپ کو خاص طور پر گہرے غور و فکر کی دعوت دیں گے (مثلاً) پرویز صاحب کے پہلے خطاب (قیامتِ موجود) میں "مذہب اور دین کی کشمکش" کو جس وضاحت سے پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا آخری خطاب "انسانیت کے بنیادی حقوق" سے متعلق تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں' اس منشور کی روشنی میں خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ جو مملکت ان حقوق کو اپنے آئین کی بنیاد قرار دے' اس کے لئے اسلامی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

کنونشن میں ایک اجلاس، قوم کے نوجوانوں کے مسائل پر غور و فکر کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ نوجوانانِ ملت کی طرف سے جو تقاریر اس اجلاس میں ہوئیں وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں کہ ؎ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

اس کنونشن کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس میں اس درسگاہ کے قیام کے لئے اولین قدم اٹھایا گیا جو قوم کی تعمیرِ نو کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دے گی۔ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔ ہمیں افسوس ہے کہ عدمِ گنجائش کی وجہ سے اشاعتِ حاضرہ میں کنونشن کی تمام تقاریر شائع نہیں ہو سکیں۔ باقیماندہ طلوعِ اسلام کے آئندہ پرچہ میں شائع ہوں گی۔ یہ پرچہ یکم جولائی کو شائع ہوگا۔

آہ اُمِّ عاکف طاہرہ کشفی!

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں!

آہ! ۲۳ اپریل کی صبح زہرہ گداز۔ یہی قیامت آفریں صبح تھی جب کہ کراچی کی کنٹری کلب روڈ پر ایک تیز رفتار ٹرک سامنے سے آتے ہوئے رکشا کو اندھا دھند کچلتے ہوئے گزر گیا اور ایک خاتون اپنے دو ننھے منے جگر پاروں سمیت اس المیہ کی نذر ہو گئی۔ بظاہر اس سے ٹریفک کے آئے دن کے حادثوں میں ایک نئے حادثے کا اضافہ ہو گیا۔ اور بس۔ لیکن اس کے بعد چند لمحوں میں طلوعِ اسلام کے کاشانۂ فکر و نظر میں جو قیامت کے تہلکے برپا ہو گئے ان کا اظہار قلم کی زبان سے ممکن نہیں۔ ابھی سہ پہر کو جب پرویز صاحب کے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مفکرِ قرآن نے آہستہ سے ریسیور اٹھایا تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے

سب سے دلدوز حادثہ کی خبر سننے والے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد..... انہیں جو کچھ سننا پڑا اس نے دامن صبر و قرار اور متاع ہوش و حواس پر بجلیاں سی گرا دیں۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور چھوٹ گیا اور دل کو تھامتے ہوئے وہ شدتِ کرب و ملال کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گئے۔ آہ طاہرہ کشفی ـــــ پروفیسر ابوالخیر کشفی کی شریکِ حیات۔ قرآنی احباب کی قابلِ فخر عزیزہ بہن اور غم نصیب مفکرِ قرآن کی سب سے پہلی طاہرہ بیٹی اور ان کی بیش بہا آرزوں کا چراغ ـــــ جسے انہوں نے برسوں خونِ جگر سے تربیت دی۔ اور اس کے قلب و نگاہ کو قرآنی فکر کی روشنی عطا کی۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے "طاہرہ بیٹی کے نام خطوط" لکھے اور والہانہ امید کی بتیاں بیوں کیا اس ساعتِ سعید کا انتظار کرتے رہے جب قرآنی فکر کی درسگاہ اس کی تنویروں سے جگمگا اٹھے لیکن حیف ! ا

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ان سہانی آرزوؤں اور امیدوں نے ۲۳ر اپریل کو لرز لرز کر دم توڑ دیا۔ "بابا جی" کی پیاری بیٹی، دو بچوں سمیت۔ جہانِ رنگ و بو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عالمِ افلاک کو سدھار گئی جہاں سے کوئی بھی آج تک لوٹ کر واپس نہیں آیا۔

فطرت کے قوانین بڑے اٹل ہیں اور قاضیٔ تقدیر کے بے لچک فیصلے دکسی کی مقدس آرزوؤں کی رعایت کرتے ہیں اور نہ زخم خوردہ جذبات سے ہمدردی کے روادار ہیں۔ عزیزہ طاہرہ بہن قضا و قدر کے ایسے ہی بے لچک فیصلے کو لبیک کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور پسماندگان کو دلدوز سسکیوں، جگر سوز کراہوں ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں اور گرم گرم آنسوؤں کی سوگوار فضا میں وقفِ اضطراب چھوڑ گئی۔ محترم کشفی صاحب پر جو قیامت ٹوٹی، پرویز صاحب کے دل پر جو بجلیاں گریں اور ادارہ و احباب کو جو صدمہ برداشت کرنا پڑا وقت کی رفتار اس کی تلافی نہیں کر سکے گی۔ اس حادثۂ قیامت میں دل کی لرزشوں کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے ادارہ، محترم کشفی صاحب اور پرویز صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور سب سے پر خلوص تعزیت کے ساتھ ساتھ مرحومہ بہن کے لئے بارگاہِ رب العزت میں دعائے مغفرت کرتا ہے۔ خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے !

شریکِ غم ـــــ ادارہ طلوعِ اسلام

(بقلم صفدر سلیمی)

"ابو عاکف"

تیز ترک گامزن

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
لگائے آگ جو گھر کو ہمارے سات چلے

ساتویں

طلوعِ اسلام کنونشن

کی

روئداد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

نسیم، جرسِ غنچہ اور قافلۂ نوبہار کے ساتھ ساتھ "کہیں" کا لفظ تو دیکھئے۔ اس ابہام میں کتنی وضاحت ہے — غنچے چٹکتے ہیں تو پھولوں کی نوید سناتے ہیں بلکہ ان کا چٹکنا تو عملِ تخلیق ہے۔ یوں فضائیں رنگ و بو کا لبادہ اوڑھ کر بہار کی محفلیں آراستہ کرتی ہیں۔ یہی ہے وہ منزلِ مراد جسے دل چاہے تو بہار کہہ لیجئے۔

جب مجھ سے طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن میں شرکت کے لئے کہا گیا تو مجھے اپنے صحنِ چمن میں نویدِ بہار کا انتظار تھا یہ انتظار متقاضی تھا کہ کراچی کی حدود سے باہر نہ نکلوں — لیکن جیسے مصحفی نے یہ شعر میرے کان میں چپکے سے پڑھ کر مجھے رختِ سفر تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ بہار اسے نہیں کہتے کہ میرے گھر کے آنگن میں یا آپ کے گھر کے آنگن میں پھولوں کا تبسم کھیلے بہار تو اس کو کہتے ہیں جب ایک دوسرے کے گھر کا سراغ ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی خوشبو دے۔

کراچی سے لاہور تک

۱۰ اپریل کو میں تیز گام سے لاہور کے لئے روانہ ہو گیا۔ شفیع صاحب، خان بخت جمال ظفر صاحب اسلام صاحب، مولانا عبدالرب صاحب اور بعض دوسرے احباب مجھ سے پہلے ہی لاہور پہنچ کر "طائرانِ پیش رس" بن چکے تھے۔ میرے ساتھ بھی چند احباب اس قافلۂ نوبہار کے ساتھ مل جانے کے لئے سفر کر رہے تھے — علاؤالدین صاحب، قاسم بھائی وغیرہ۔

سفر تیز گام کے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے طویل تر ہو گیا۔ لیکن یہ تاخیر بھی ایک اعتبار سے مبارک ہی ثابت ہوئی۔ میرے ڈبے میں دو نوجوان بھی تھے۔ یہ دونوں انگلستان سے معاشیات اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آ رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح خود بخود طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کا ذکر چھڑ گیا۔ ہاں پہل میں نے نہیں کی تھی، اس نوجوان نے کی تھی۔ جو معاشیات کا ذہین اور زیرک طالب علم تھا۔ جو غیر ملکی بیرونی امداد اور موجودہ معاشی رجحانات سے اس لئے آزردہ تھا کہ اگر ہم انہی راستوں پر چلتے رہے تو اپنی نظریاتی بنیادیں کھو بیٹھیں گے اور معاشی خوش حالی کی منزل پر بھی نہ پہنچ سکیں گے ہمارے نوجوانوں کو دین سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ علمائے کرام اکثر محراب و منبر کی بلندیوں سے دیتے ہیں۔ کاش علمائے

نوجوانوں کو ذرا قریب سے دیکھیں جو آج کتنے ہی علوم کو اسی طرح "مسلمان" بنا رہے ہیں جیسے کبھی ہمارے اسلاف نے یونانی علوم کو بنایا تھا۔

کنونشن گاہ میں

تبلیغ صاحب لاہور کے اسٹیشن پر ملے۔ یہ احساس ذمہ داری زندگی کو کتنا مشکل مگر لطف انگیز بنا دیتا ہے۔ ایک بجتے بجتے ہم لوگ شاہ جمال کالونی پہنچ گئے۔ جہاں خیموں، چھولداریوں اور شامیانوں کی ایک چھوٹی سی بستی زمین کی آغوش سے ابھر رہی تھی۔ اہل جنوں وطن عزیز کے مختلف حصوں سے آ پہنچے تھے —— نہ جانے یہ کیسے لوگ تھے کہ طویل سفر کی کلفتیں ان کے چہرے پر تبسم بن گئیں۔ ان سے کہا جاتا کہ "تھوڑی دیر آرام کر لیجئے" اور وہ جواب دیتے۔ "واہ صاحب! ہم آرام کرنے آئے ہیں کہ اپنے رفیقوں سے ملنے۔"

تھوڑی دیر کے بعد طعام گاہ (ایک بڑا شامیانہ) میں دوپہر کے کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سادہ سا اجتماعی کھانا ایک ایسی تقریب بن گیا جس میں سلیقہ چاکان چمن کی یک جائی نے تمام دو دہن کو نئی لذتوں سے آشنا کیا۔ وہ لذتیں جن کی آمائش کا سلسلہ دار و رسن تک جاری رہتا ہے۔

شام تک بستی بس گئی۔ "کنونشن کا پنڈال" "طعام گاہ"۔ "مندوبین و مبصرین و نمائندگان کی آرام گاہ"، "مسجد" "بک سٹال" "ریسٹورانٹ" —— یہ تھے اس بستی کے مقامات آرام گاہ، طعام گاہ اور چائے خانہ سے مسجد "پنڈال" اور بک اسٹال تک۔ ایک طرف جسم کی پرورش اور دوسری طرف روح کی بالیدگی —— یوں یہ بستی اسلامی نظام کا ایک اشارہ بن گئی۔ اسلام اور قرآن کا خدا جو روٹی بھی دیتا ہے اور روح کی بالیدگی و نشو و نما کے اسباب بھی مہیا کرتا ہے۔

مغرب کی نماز پڑھ کر میں نے آرام گاہ کا رخ کیا۔ وسیع شامیانے میں یہاں سے وہاں تک چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں بڑی نمایاں تھیں۔ پہلی بات یہ کہ مختلف مقامات کے مندوبین نے اپنے اپنے گروہ نہیں بنائے تھے بلکہ وہ اس طرح تقسیم ہو گئے تھے کہ اجنبی چہروں سے خارجی آگاہی حاصل کریں۔ خارجی آگاہی سے میری مراد یہ کہ ایک دوسرے کے نام سے آشنا ہو جائیں، ان کے مقامی مسائل کو سمجھیں —— ورنہ یہ سب ایک دوسرے کے ہم سفر ہیں۔ ایک کا دل دوسرے کے پہلو میں دھڑکتا ہے۔

قرآنی مساوات کا عکس جمیل

اور دوسری اہم اور نمایاں بات یہ کہ مندوبین میں اکثریت غریبوں کی تھی —— کسان، چھوٹے چھوٹے زمین دار اور کاشتکار جو اپنی زمینوں پر خود کاشت کرتے ہیں۔ اسکولوں کے معلم اور دکاندار —— میں طلوع اسلام کی فکر سے ہمیشہ متفق رہا ہوں کیونکہ میں نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے شعور کے سائے میں آنکھیں کھولی تھیں اور ہوش سنبھالا تھا اور سات آٹھ برس کی عمر میں طلوع اسلام کا وہ ابتدائی شمارہ پڑھا تھا جس کا اداریہ علامہ اقبال کی موت سے متعلق تھا اور یہ نسخہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ ان دنوں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ طلوع اسلام کی فکر اور پیغام سے متفق ہونے کے باوجود یہ خیال دامن گیر مجھے ستاتا رہا کہ باتیں تو ٹھیک ہیں مگر علوم حاضرہ کی

بلند ترین سطح سے قرآن کے حقائق کو بے نقاب کرنا ہمارے عوام کے کس کام آئے گا؟ لیکن اس مجمع کو دیکھ کر یہ خیال جیسے میرے ذہن سے ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا۔ زمین کے یہ بیٹے جو تند جھکڑوں کے مقابل نرم و نازک پودوں کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ جو آسمان کے رنگ کو دیکھ کر بارش۔ آندھی اور موسم کے تغیرات کی ایسی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ محکمۂ موسمیات والوں کا علم اور ساز و سامان بھی شرمندہ ہو جاتا ہے یہ حقائق کی گود میں پلے ہوئے لوگ ہی اس حقیقتِ کبریٰ کو نسبتاً آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں، جسے اسلام سمجھتے ہیں۔ میری یہ بات محض جذباتی نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اسلام کو سب سے پہلے جس نے اپنے سینے سے لگایا وہ مکہ کے زیر دستوں، کمزوروں اور لاچاروں کا طبقہ تھا۔ اور قریشِ مکہ نے اسلام کی مخالفت شد و مد سے اسی لئے کی تھی کہ اس انقلابی پیغام کی زد ان کے مفادات پر پڑتی تھی۔

دو چارپائیوں پر چار ساتھی بیٹھے تھے۔ بیچ میں حقہ رکھا ہوا تھا۔ نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی۔ اقبالؔ کا وہ مصرعہ مجھے یاد آیا جس میں اس نے مومنوں کی محفل آرائی کا نقشِ جمیل یوں پیش کیا ہے۔

ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

میرے قدم بے ساختہ اسی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر میں نے سلام کرنے کے لئے ہونٹوں کو جنبش دی ہی تھی کہ چار آوازوں نے مجھے سلام و رحمت سے نوازا۔ چاروں نے بیک وقت اپنی اپنی جگہ سے سمٹ کر میرے لئے جگہ بنائی۔ اجنبیت کا احساس گفتگو سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ میں بیٹھا۔ چاروں میں سے جو صاحب سب سے معمر تھے انہیں میں نے گفتگو کے لئے چنا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"جی۔ پنج کسی ضلع ملتان سے" ۔ (ملتان کے ایک قصبہ کا نام تو معلوم ہو گیا۔)

"جناب کا اسم گرامی"؟

"بندے کو عطا محمد علوی کہتے ہیں۔ پنج کسی سے ہم چار آدمی آئے ہیں۔ میں، محمد شفیع، محمد علیم، احمد دین صاحبان"۔

"آپ وہاں کیا شغل کرتے ہیں"؟

"فی الحال تو میرا شغل طلوعِ اسلام اور افکارِ قرآنی کی ترویج ہے۔ پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ میں معلم تھا۔ پھر دکانداری شروع کی۔ بیمار پڑا تو دکان بند کر لی۔ اچھا ہوا تو یہ نشہ مجھ پر چھا گیا ہے"۔

"تحریک سے وہاں کتنے لوگ وابستہ ہیں"؟

"جی۔ پنج کسی چھ ہزار کی آبادی کا قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے ۴ ممبر ہیں۔ مگر آپ اداس کیوں ہو گئے؟ ذرا سوچئے تو جہاں تعلیم نہ ہو، محنت مزدوری اور معاش کی فکر تاروں کی چھاؤں کے ساتھ بیدار ہوتی ہو اور سوتے میں بھی پیچھا نہ چھوڑتی ہو، حق و ناحق کا معیار ذات برادری ہو ــــ وہاں ۴ ممبر کچھ ایسے تھوڑے تو نہیں ــــ آپ تو جی۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہتے ہو آپ کو کیا پتہ کہ ہم ۴ آدمی جو ممبر بنے ہیں، انہوں نے قرآن کے لئے کیسے کیسے بندھن توڑے ہیں ــــ

یوں سمجھو کہ مذہب کا تصور یہ ہے کہ بستی میں مسجد بنا دی۔ اور ایک میاں جی مقرر کر دئے جو مؤذن بھی ہیں۔ پیش امام بھی اور میاں جی بھی اور ہر چھ ماہ بعد۔ فصل کی کٹائی پر انہیں دانے دیدئے۔ جی، اپنا ایمانی فرض پورا ہوگیا۔ اب رہے میاں جی، تو دانوں کے بدلے انہیں کچھ کام تو کرنا ہی ہوتا۔ جب کچھ بوڑھے ان کے پاس جمع ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں مسئلہ مسائل سناتے ہیں۔ مگر نوجوانوں نے میاں جی کا دوسرا مصرف نکالا ہوا ہے، ادھر بارش ہوئی اور اُدھر نوجوانوں نے ان سے کہا کہ "جی ساون یوسف زلیخا والا قصہ سناؤ" ـــ یہ ہے مذہب اور زندگی ہمارے قصبوں کی ـــ ہم اسے بدل رہے ہیں۔ مدتوں کا بگاڑ، بناؤ کے لئے بڑا دامن مانگتا ہے۔ محنت ہم کر رہے ہیں۔ مگر جی، اس کا اجر کسی سے نہیں مانگتے اور نتیجہ مرتب کرنا بھی اسی کا کام ہے جس کی رضا کے لئے یہ ریاض کر رہے ہیں"۔

میں نے عطا محمد علوی صاحب کی یہ باتیں اور اپنی دیہی زندگی کا تجزیہ ان کی زبانی سن کر یہی بات کہہ دی کہ میرا مکتبی علم آپ کے تجربوں سے بہت چھوٹا ہے۔ یہ سچ ہے زندگی ام الکتاب ہے۔ اور پھر میں نے ان سے پوچھا کہ وہ طلوع اسلام اور اس کی تحریک سے کیسے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے مجھے بتایا۔ "۱۹۴۶ء میں، میں جالندھر میں تھا۔ انتخابات کے سلسلے میں میں اپنے گاؤں میں اکیلا آدمی تھا جو مسلم لیگی امیدوار چودہری عبدالسلام کی حمایت کر رہا تھا۔ ہمارے علاقہ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں میں نے ایک نظم پڑھ کر سنائی جس کا عنوان تھا "امام" ـــ اور یہ نظم رسالہ طلوع اسلام دہلی میں چھپی تھی۔ یہ رسالہ میرے ایک عزیز نے لا کر دیا تھا۔ جلسہ ختم ہوگیا۔ نظم پڑھی جا چکی۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اس رسالہ کے مضمون بھی دیکھ لوں۔ مضمون ایسے بھلے معلوم ہوئے جیسے میرے دل کی بات لکھی ہے ـــ یوں اس رسالہ سے میرا ذہنی تعلق قائم ہوا ـــ مگر جی، کچھ دنوں کے بعد جب مشرقی پنجاب مسلمان کے خون سے، شام کے آسمان پر آسمان جیسے شفق کی طرح رنگین ہوگیا تو ہم یہاں چلے آئے ـــ ان خونیں واقعات و حوادثات سے ذہن سب کچھ بھول گیا۔ لیکن سنہ اکونجا (۱۹۵۱ء) میں پھر طلوع اسلام مجھے ہاتھ لگا۔ حاجی میران بخش، اہل حدیث صاحب منگاتے تھے اُن سے لے کر میں اور حکیم احمد دین پڑھتے تھے ـــ پھر یہ ہوا کہ ہم خود منگانے لگے۔ اور پھر ایسے قرآنی رنگ میں ڈوبے کہ اب ہم کو کوئی رنگ بھلا نہیں لگتا"ـــ

عطا محمد صاحب سے میں نے اپنی یہ اولین ملاقات خاصی تفصیل سے لکھ دی ہے۔ مگر صاحبو! میں کروں تو کیا کروں قسم لے لیجئے۔ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ انسان کے اختیار (بحد بشری) پر ایمان رکھتے ہوئے مجبوراً یہ بات کہتا ہوں کہ لکھنے والے کا قلم سچ مچ اُس کے بس میں نہیں ہوتا ـــ یہ ہمارے ذہن اور مشاہدہ و مطالعہ سے اپنا خراج وصول کر کے رہتا ہے اور پھر اکہتر بہتر برس کا یہ اکہرے جسم کا منحنی سا آدمی محض عطا محمد ہی تو نہیں ـــ یہ تو بزم طلوع اسلام کے اراکین کے ذہن اور مزاج کا نمائندہ ہے ـــ کتنا عجیب تجربہ تھا، اس کے ساتھ باتیں کرنا "اکونجا" کہنے والے اس پنجابی کی اردو کی شادابی اور مہک تو دیکھئے جیسے پنجاب کے کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں لہلہا رہی ہوں اور کبھی

کے پھٹنے والوں کی مہک فضا میں لہریں بنا رہی ہو۔ خلوص دلوں کو ہی فتح نہیں کرتا۔ لہجہ کو بھی مسخر کر لیتا ہے۔

باتوں ہی باتوں میں ساڑھے سات بج گئے ——— میں نے عطا محمد صاحب سے اجازت لی ادھر ادھر دیکھا۔ تو خان بخت جمال کی وہ سفید ڈاڑھی نظر آئی جیسے ہی تھے۔

چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

کہنا پڑتا ہے۔ حیرت ہوئی کہ اتنی دیر میں صدر صاحب کا وہ قہقہہ ایک بار بھی نہ گونجا جو مشکلات کے رخ پھیرنے کے ساتھ ساتھ کانوں کے رُخ بھی موڑ دیتا ہے ——— مگر وہ کسی باریک نقطہ کو سلجھا رہے تھے ——— اتنے میں ایک اور صاحب پر نظر پڑی جن کے چہرے پر کیموبا کے باغی لیڈروں کی سی سختی اور چال میں سابق خاکساروں کا سا انداز موجود تھا۔ وہ آرام گاہ سے نکل رہے تھے ——— میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں ——— معلوم ہوا یہ ہیں عزیز قریشی۔ ان کے بارے میں میرا یہ ابتدائی تاثر کچھ ایسا غلط نہ تھا۔ وہ سابق خاکسار تو نہ نکلے مگر سابق فوجی ضرور ثابت ہوئے۔ اور ان کے چہرے کی سختی سچ مچ اسی حقیقت کی غماز تھی کہ قرآن کے پیغام کی ترویج کے لئے ان کی بے تابی ان کے اعصاب کو ساز کے تاروں کی طرح ہر وقت کھنچا ہوا رکھتی ہے۔

ساڑھے سات بجے وسیع طعام گاہ میں رات کا کھانا شروع ہوا۔ بیشتر لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ خود کھانے سے زیادہ یہ دیکھ رہے تھے کہ دوسرے کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

تعارفی نشست

کھانے کے بعد نمائندگان، مندوبین و ممبرین کا تعارفی اجلاس خان بخت جمال خان کی صدارت میں شروع ہوا۔ خان جمال بخت، جنہیں پورا سابق صوبہ سرحد "صدر صاحب" کہتا ہے، جن کا کردار ان کی ریش سپید کی طرح بے داغ ہے۔ جن کی عظمت کی گواہی دوستوں سے زیادہ دشمن دیتے ہیں ——— اور وہ بھی اس دورِ مکر و سیاست میں ——— اس دور میں جب صاحبانِ عمامہ و عبا حاکم بدہن، اپنی عہد شکنی کے جواز میں سیرتِ محمدؐ عربی (فداہ ابی و امی) کو داغدار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حافظ برکت اللہ صاحب نے تلاوت قرآن مجید فرمائی ——— وہ حافظ جو قرآن کی ہر اصطلاح کی گہری معنویت سے آگاہ ہے ——— جو تلاوت یوں کرتا ہے، جیسے ہر لفظ کی تشریح بھی اس کا لہجہ ساتھ ساتھ کرتا جا رہا ہے۔ حافظ برکت اللہ خوش الحان نہیں، قرأت سے واقف نہیں۔ یہ کیفیت تو تفہیم قرآن کا لازمی نتیجہ ہے۔ تلاوت کے بعد مرزا خلیل صاحب نے اقبالؒ کی حجازی لے چھیڑ دی۔

؎ پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی

میرزا خلیل جو اس قرآنی قافلے کے حدی خواں ہیں ——— جن کی شعر خوانی میں بڑھتے ہوئے قدموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔

پہلے کراچی کے مندوبین کے تعارف کی خدمت شفیع صاحب نے انجام دی۔ وہ مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہیں ایک ایک ساتھی کا نام لے رہے ہیں۔ وہ سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور شفیع صاحب اس کا تعارف کراتے ہیں۔ مختصر سے الفاظ — ہر ایک کا تعارف دوسرے سے مختلف۔ سوچئے کتنا مشکل کام تھا۔ جب کہ ان ساتھیوں میں کتنی ہی باتیں مشترک تھیں۔ — خلوص۔ قرآن سے لگاؤ۔ محنت، جدوجہد میں شفیع کے تعارفی کلمات سنتا جاتا۔ اور مجھے یوں لگتا جیسے ان جملوں کی مدد سے آج اپنے ان دوستوں کی حقیقی شخصیت سے متعارف ہو رہا ہوں — اور بیچ بیچ میں پرویز صاحب کا کوئی چھوٹا سا جملہ جیسے تعارف کا عنوان بن جاتا — یا یوں کہئے کہ "بیت الغزل"

"یہ ہیں محمد اسلام — میں نے جب پہلی بار انہیں کراچی میں پرویز صاحب کے درسِ قرآن میں دیکھا تو یہ مائیکروفون سنبھالے ہوئے تھے — میں سمجھا کہ الکٹریشین ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ ....."

اور شفیع صاحب کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ نہیں پرویز صاحب نے یوں اس کی تکمیل کی کہ — "خود بجلی ہیں"

پھر بھائی وزیر محمد کا نام ہی شفیع صاحب نے لیا تھا کہ "پرویز صاحب نے پوچھا" اور انہیں کتنا گھسیٹا تھا "؟" —

قاسم عبدالرحمٰن سامنے آئے — جن کی سب سے بڑی تمنا برسوں سے کنونشن میں شرکت رہی ہے۔

"عبدالقادر محمد صدیق" — شفیع صاحب نے ابھی کچھ کہا بھی نہ تھا کہ کسی گوشے سے آواز آئی — کیا وہ آدمی ہیں؟"

ڈاکٹر شمس الدین۔ علاء الدین۔ ملک وحید۔ حافظ برکت اللہ۔ مولانا عبدالرب اور دوسرے احباب کا تعارف شفیع صاحب نے بڑے سلیقے سے کرایا۔ مگر بات ذرا ادھوری رہ گئی تھی۔ پرویز صاحب آئے۔ انہوں نے اس کمی کو پورا کیا — بھلا تعارف اور کسے کہتے ہیں۔

مولانا عبدالرب کے تعارف کی اساس میر کے اس شعر کو بنایا (قدرے تصرف کے ساتھ)

مت سہل انہیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور شفیع صاحب کا تعارف۔

شمعِ نظر۔ خیال کے انجم۔ جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تیری محفل سے آئے ہیں

شخصیت پرستی ہمارا مسلک نہیں — اس کے خلاف ہم برسرِ پیکار ہیں۔ مگر یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے کہ شفیع بہتوں کے بعد آئے مگر اس پختہ ذہنی اور پختہ کاری کے ساتھ کہ وہ اب اس تحریک کے تیر اندازوں میں سے ایک ہیں۔

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے مندوبین کے تعارف کے فرائض، بزم لاہور کے نمائندے میاں عبدالخالق کی اجازت سے نظامی صاحب نے انجام دئے۔ ویسے تو کنونشن کے انتظامات سے بڑھ کر ان دوستوں کا تعارف اور کیا ہو سکتا تھا!

لاہور والے انتظامات میں اس طرح مصروف تھے کہ ہر شخص کہیں نہ کہیں قلب کی طرح نظم کو سنبھالے بیٹھا تھا۔

بزمِ طلوعِ اسلام کوئٹہ کے اراکین کا تعارف ملک غلام کبریا ترکانی صاحب نے کرایا۔ ترکانی صاحب جنہوں نے پرویز صاحب کو دورۂ کوئٹہ کی دعوت جس ذوق و شوق سے دی ہے اس سے ان کے حسنِ عمل کا اندازہ ہوا۔

راولپنڈی کے مندوبین و مبصرین کا تعارف عزیز قریشی صاحب نے کرایا۔ وہی قریشی صاحب جن کو میں سابق خاکسار سمجھا تھا۔ عزیز قریشی تعارف کراتے ہوئے نہایت احتیاط سے الفاظ استعمال کر رہے تھے جیسے ایک ایک لفظ قطرۂ خونِ جگر تھا جس کا انہیں حساب دینا پڑ رہا تھا۔ صداقت شعاری کیسی بڑی ذمہ داری ہے۔

خان عبدالحکیم خان مردان کے مندوبین و مبصرین کا تعارف کرانے اسٹیج پر آئے۔ خان بخت جمال جمالی بھی ہیں اور جلالی بھی۔ مگر حسیلہ کا یہ پٹھان تو ہمہ تن جمال دنور ہے۔ تعارف میں پٹھان کی صاف گوئی بھی تھی اور ایسا نکھرا ہوا ذوقِ مزاح جو آدمی کو حیرت میں ڈال دے۔ لوگ اللہ سے "ایمان" "صحت" اور "علم" کی دعا کرتے ہیں۔ اگر حُسنِ مزاح کی دُعا بھی کرنے لگیں اور اللہ ہم میں سے بیشتر کو یہ حسن عطا کر دے تو زندگی کتنی خوبصورت بن جائے ——— مزاح تو سایہ دار درختوں کی وہ مسلسل قطار ہے جو زندگی کے سفر کو آسان بنا دیتی ہے ——— اور پھر مزاح سے آدمی کے "کلچر" اور تہذیبی سطح" کا پتہ چلتا ہے (کبھی کسی مولوی میں بھی آپ کو ذوقِ مزاح کی لطافتیں نظر آئیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو مجھے ان کا پتہ دیجئے ممنون ہوں گا)۔

خان عبدالحکیم خاں نے لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے اس تحریکِ قرآنی سے اپنے رشتہ کا ذکر بھی بہ سبیلِ تذکرہ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں "معارف" اعظم گڑھ میں انہوں نے پرویز صاحب کے مضامین پڑھے ——— اور ان مضامین میں اپنے اندازِ فکر کی جھلک دیکھی۔ (دیکھا آپ نے، اندازِ فکر کے اعتبار سے اس قافلہ کے بعض راہی پرویز صاحب کے ہم عمر ہیں) دفورِ جذبات کے ساتھ پرویز صاحب خود اسٹیج پر آئے اور انہوں نے خان صاحب کا تعارف خود کرایا۔

"بزمِ طلوعِ اسلام" کا تصور اور خاکہ خان عبدالحکیم خاں کا دیا ہوا ہے۔ یہ اس وقت سے "طلوعِ اسلامی" ہیں جب طلوعِ اسلام نکلا بھی نہ تھا۔

"یہ مردان میں بیٹھے ہیں۔ اکوڑا۔ پشاور اور قدامت پرستی کے ایسے ہی مراکز کے درمیان ——— اور ان کی آواز اور سکونِ قلب میں ایک لمحہ کے لئے بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا"

واہ کینٹ۔ میانوالی۔ بورے والہ۔ ڈیرہ غازی خاں۔ سید حسین ضلع جہلم۔ پنڈدادن خاں ضلع جہلم، چینوٹ۔ لیہ۔ دیونا منڈی (گجرات)، کلری (ضلع جھنگ) ۱۰ چک شمالی، ملتان۔ کنجاہ۔ شکرگڑھ۔ چونڈا۔ گجرانوالہ اور ایسے ہی دوسرے مقامات کے نمائندگان و مندوبین کا تعارف باری باری کرایا گیا ———

میں اپنے آپ کو مغربی پاکستان کے جغرافیہ کا خاصا ماہر سمجھتا تھا ——— "سرائے عالمگیر" "بھکر" "چارسدہ" "تخت بائی"

پتوکی جیسے مقامات کی خاک چھان چکا ہوں جن کے نام سنتے ہی کراچی والے حیرت سے الٹی سیدھی سانسیں لینے لگتے ہیں مگر کونشن نے مجھے اپنے وطن سے اپنی لاعلمی کا شدت سے احساس دلایا۔ "دیونا منڈی۔ چونڈا۔ کلکی۔ ٹبہ داود خان" ۔ یا الٰہی ان ناموں کی بستیاں بھی موجود ہیں۔ اور موجود ہی نہیں بلکہ ان میں "اسلامی نظام ریاست" کے طائران پیش رس رہتے بستے ہیں۔ یہ لوگ جن میں اتنی استطاعت نہیں کہ اچھے جوتے پہن سکیں، معقول لباس پہن سکیں، (دکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ معقول آدمی" معلوم ہوسکیں)..... یہ لوگ اس نظام کو عملی حقیقت بنانے کے لئے اپنے کاروبار اور آرام کو تج چکے ہیں جس میں بلوریں ظروف، اطلس و کمخواب کے پردے، حسین ملبوسات، قیمتی نشست گاہیں۔ ہر فردِ ملت کے قدموں پر نثار ہوں گے اور یہ افرادِ ملت اس وقت بھی آفاق میں گم نہ ہوں گے۔ اور متاعِ دنیا کی ان نعمتوں کے افراط کے باوجود اپنے خالق کے ذکر کو دل و نظر کا سرمایہ بنائیں گے۔ آپ میں سے اگر کوئی صاحب طنزاً یہ فرمائیں کہ پرویز کے نزدیک یہ ہے زندگی کا ماحصل؟ لاحول! تو ذرا یہ بھی سوچ لیں کہ ان کے نشتر کی زد کہاں تک ہے۔ یہ پرویز کی دنیا نہیں۔ قرآن کے خدا کی جنت ارضی ہے۔ یہ الگ بات کہ

اُسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

اور بھلا "اپنی بیویوں سے بیزار" اور جنت کی حوروں کے اضطراب میں مبتلا لوگ اس نکتہ کو کیا سمجھیں گے کہ

ع جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اس کنونشن میں پاکستانی نمائندوں کے علاوہ ایران، لندن اور مغربی جرمنی کے احباب بھی شامل تھے۔ ان میں سے محمود الٰہی صاحب (ریمبرگ، مغربی جرمنی) سے ان تین چار دنوں میں بڑی قربت حاصل ہوگئی۔ ان کو میں کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن میں پہلے دو چار بار دیکھ چکا تھا اور اپنی اس حیرت کا ذکر بھی کسی سے کیا تھا کہ کیا یہ "غیر ملکی" اور جانتا ہے۔ مگر آپ محمود الٰہی کو دیکھیں تو مشرق میں عرصہ سے مقیم امریکی سمجھیں گے، جس کی تھوڑی بہت رنگت ہمارے تیز سورج کی کرنوں نے چھین لی ہو۔ مگر میں انہیں ترک سمجھتا تھا ۔ جی چاہے تو اس بات پر ہنس لیجئے یا رو دیجئے کہ اگر اپنا ہی کوئی سُرخ و سپید، صحت مند اور بالا قد بھائی کہیں نظر آجاتا ہے تو اسے ذہن دیار غیر سے متعلق سمجھتا ہے۔ جیسے حسن و صحت سے ہماری قوم کو ازلی بیر ہوگیا ہو۔ عرصہ کی غلامی سے صرف شوخیٔ فکر و کردار ہی ماند نہیں پڑ جاتی جسم بھی ٹھٹھر جاتے ہیں۔ چہروں سے شادابی روٹھ جاتی ہے

شب زندہ داروں کی انجمن تعارفی اجلاس کے بعد کتنے ہی چھوٹے چھوٹے غیر رسمی جلسے آرام گاہ میں شروع ہو گئے رات کی زلفیں کمر سے نیچے جا پہنچیں، مگر آج تو نیند کسی کی آنکھوں میں نہ تھی ۔ یہ لوگ ایک سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ جدائی کی گھڑی ابھی دور تھی۔ مگر دل اس کے اندیشہ سے دھڑک رہے تھے۔

دُنیا جہان کی باتیں یاد آرہی تھیں ــــ مگر یہ باتیں ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی تھیں ۔ قرآنی تحریک کا محور!

آنام گاہ کے ایسے ہی لمحات میں کئی دوستوں سے ملاقات کی تجدید کی ۔ کچھ نئے دوست ملے ۔ پرمولی کے قاضی کے صاحبزادے ــ اور پھر سید علی جوہر ۔ گوجر گڑھی کا وہ نوجوان جو ایک مظلوم کے حق میں پولیس کے خلاف گواہی دینے کے لئے آمادہ ہوگیا ۔ مگر اس مظلوم کو دس ہزار کی بستی میں کوئی دوسرا گواہ نہ مل سکا ۔ وہ بستی جہاں آٹھ دس مسجدیں نمازیوں سے آباد رہتی ہیں ــــ اور وہ پنڈدادن خان کے عبدالرحیم خاں ــــ ش ، ق نہایت درست ۔ یہ تو شاید زیادہ حیرت کی بات نہ تھی ۔ بمشکل یہ آپڑی کہ " ع " کا تلفظ عربیت کے ساتھ ادا کرتے ۔ معلوم ہوا کہ حالی کے دلیں پانی پت کے رہنے والے ہیں ۔ اچھا ہوا وہاں سے چلے آئے ورنہ شاید پانی پت کی چوتھی جنگ کے ہیرو ہوتے ۔ ۱۹۵۶ء سے تحریک طلوع اسلام سے وابستہ ہیں پہلے بریلوی تھے ــ مذہبی عقائد کے شکنجہ نے جب روح کو جکڑا تو زقند لگائی اور دیوبندی ہوگئے ۔ طبیعت کو سکون نہ ملا ۔ آخر دیوبندیوں کے اس گروہ میں شامل ہوگئے جسے عام دیوبندی بھی متشدد کہتے ہیں یعنی (مولانا) حسین علی واں بھچراں والے (ضلع میانوالی) کا گروہ ــــ سکون نہ ملا ۔ جستجو جاری رہی ۔ آخر قرآن کے دامن میں پناہ ملی ۔ فرقہ پرستی کے جرم ہائے سیاہ سے بھاگنے والے کو قرآن کے عفو بندہ نوازی میں پناہ مل سکتی ہے ۔

۱۲/اپریل

رات کی شب بیداری کے بعد صبح آٹھ بجے کنونشن کا کاروباری اجلاس " شروع ہوا ۔ حافظ برکت اللہ صاحب کرسیٔ صدارت پر براجمان ہوگئے ۔ میں کیا کروں کہ " رونق افروز ہوئے " جیسے ٹکڑے میں اپنے حافظ کے لئے لکھ ہی نہیں سکتا (یہ اظہار اس لئے ضروری سمجھا کہ حافظ صاحب کے کوئی " معتقد " ناراض نہ ہو جائیں) حافظ عبدالمجید صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی ۔ میاں عبدالخالق نے استقبالیہ ارشاد فرمایا ۔ میاں صاحب احتیاطاً اپنی تقریریں تسکین قلب کے لئے کاغذ پر لکھ تو لیتے ہیں مگر انہیں ہر سطر کے بعد کوئی بات سوجھتی ہے اور پھر وہ کاغذ کو بھول جاتے ہیں اور " فی البدیہہ " سے کام لیتے ہیں ۔ اسٹیج سے جیسے وہ وسیع پنڈال کے ہر گوشے کو عقابی نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی آدمی کو دیکھ کر انہیں وہ سخن ہائے گفتنی یاد آجاتی ہیں جن کے بارے میں پہلے نہ سوچا تھا ۔ وہ میزان پبلیکیشنز اور قرآنی فکر کی ترویج کے لئے اپنے ہر دوست کی جیب پر نگاہ رکھتے ہیں ۔ اور ہر دم " العفو " کا سبق یاد دلاتے ہیں ۔

صفدر سلیمی صاحب نے ادارۂ طلوع اسلام کی رپورٹ پڑھی ۔ صفدر سلیمی ، جو اب طلوع اسلام کے پیدا کردہ ذہن کی مثال ہیں جن کا قلم ایک طرف تو جذبات کی گہرائیوں سے خون کی سرخی لے کر آتا ہے اور اسے روشنائی بناتا ہے اور دوسری طرف جس کی نگاہ برصغیر کی ملی تاریخ کو کھلے ہوئے اوراق کی طرح پڑھ لیتی ہے ۔

راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ نے سنٹرل فنڈ اور پبلسٹی کمیٹی کی رو داد پیش کی ۔ محمد اکرم ، جو شہرے بھی ہیں تو پلے

کی طرح ـــــ اور جنہیں دیکھ کر ہر گھڑی یہی خیال آتا ہے کہ زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ زندگی سے ان کا رویہ ایسا ہے جیسے مسافر کی ریل چھوٹنے والی ہے اور وہ دوڑتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر میں اپنے آپ سے الجھ رہا تھا اپنے ذہن کے خانے ٹٹول رہا تھا کہ کہیں ان کے نام کی "فائل" مل جائے۔ اتنا تو مجھے یقین ہو گیا کہ انہوں نے یقیناً دس گیارہ سال اُدھر اپنا زمانۂ طالب علمی کراچی میں گزارا ہے اور جب راجہ محمد اکرم سے مفصل ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنے "بھید" کو بتایا کہ آپ کو ٹھیک یاد رکھا۔ میں ۱۹۵۲ء میں ایس۔ ایم۔ لا کالج میں تھا۔ اسی زمانے میں، میں نصیر احمد شیخ اور کئی دوست پرویز صاحب کے درس میں جایا کرتے تھے۔ شاموں کو بحثیں کیا کرتے تھے ـــ گھنٹوں الجھتے تھے تب کہیں جا کر ذہن کی اس نامسلمانی سے نجات ملی جس سے اقبال جیسے مفکر نے بھی پناہ مانگی تھی۔

مذہب اور دین کی کشمکش

۱۰ بجے کاروباری اجلاس کے بعد، کنونشن کا پہلا اجلاس جام خان عبدالحکیم خان کی صدارت میں شروع ہوا۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد مرزا خلیل صاحب نے اقبال کے نغمۂ حجازی سے دلوں کو گرمایا۔ خلیل صاحب اس تحریک کے مستقل حدی خواں ہیں ـــ کلام اقبال پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ اقبال کے ایسے اشعار کا انتخاب کرتے ہیں جو اس دن کے خطاب سے گہرا معنوی رشتہ رکھتے ہیں۔ یوں کلام اقبال "خطاب پرویز" کا دیباچہ بن جاتا ہے۔ وقت کے محراب میں فکر اقبال کی شمع یوں روشن ہے کہ اس کے نور کا دائرہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آج پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا۔ "مذہب اور دین کی کشمکش ایک تقابل" اور مرزا صاحب نے جو اشعار پڑھے وہ اس غزل کے تھے ـــ

کلیسا کی نبیاد رہبانیت تھی!
سماتی کہاں اس فقیری میں میری

پرویز صاحب کا استقبالیہ خطاب

اور پھر اسی نغمۂ حجاز کے جلو میں پرویز صاحب اسٹیج پر آئے ـــ پہلے منتظمین و مبصرین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میں منتظر تھا کہ اس کے بعد وہ اپنی تقریر کا موضوع دہرائیں گے۔ اور پھر تقریر شروع کریں گے ـــ مگر انہوں نے اپنے استقبالیہ کو موضوع سے یوں ہم آہنگ کیا کہ تمہید و موضوع کے درمیان "گریز" کا احساس بھی نہ ہونے پایا۔ قرآن کی وابستگی نے مجھے پرویز سے وابستہ کیا ہے۔ لیکن شاید اس رشتہ کی اُستواری میں ان کی ادبیت اور "سخن رسی و نکتہ سنجی" کا بھی خاصا دخل ہے۔ میں ادب کی اداؤں کا اسیر ہوں (آپ کہتے ہیں بڑی بات ہے ـــ ہو گی) .... اور اسی لئے میرا ایک فیصلہ ہے، وہ یہ کہ اگر بات میں حسن ہو گا۔ عظمت ہو گی اور اس بات کی جڑیں دل میں پیوست ہوں گی تو اسلوب خود بخود ادبیانہ ہو جائے گا ـــ اسلوب تقریر بھی اور اسلوب تحریر بھی۔ اس ادبیت کی نمائش عربی و فارسی کے الفاظ کے ذریعہ صاحبان محراب و منبر بھی کرتے ہیں، مگر یہ سستی مرصع سازی کے سوا کچھ نہیں ہوتی ـــ

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

یہ خطاب جسے دین و مذہب کی کشمکش کا طویل نام دینے کی جگہ "قیامت موجود" کہئے ایک اعتبار سے نہایت اہم ہے جب ہم اسلام کو محض رسوم و عبادات تک محدود دیکھتے تھے تو اس اسلام سے گریز کرنے کو جی چاہتا تھا۔ پھر علماء نے بھی یہ کہنا شروع کیا کہ دین وسیع تر حقیقت ہے جو حیات کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور مذہب محض شعائر۔ لیکن اس خیال سے جو نیا نکتہ اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اگر پیشوائیت، سیاسیات و عمرانیات سے متعلق اپنے خود ساختہ خیالات سے "مذہب" کے دامن کو وسیع کرلے تو بھی مذہب، مذہب ہی رہے گا۔ دین نہ بن جائے گا۔ دین وہ ہے جو وحیٔ الہٰی عطا فرمائے۔

پرویز صاحب کے خطابات اس شمارہ میں اپنی مکمل صورت میں شائع ہو رہے ہیں لیکن اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کا حق تو آپ مجھ سے چھیننا پسند نہ کریں گے۔

پرویز صاحب نے "چراغِ مصطفویؐ" اور "شرارِ بولہبی" کی ستیزہ کاری کی علامتوں کے ذریعہ اس حقیقت کو پیش فرمایا کہ یہ کش مکش سدا سے جاری ہے اور یہی دین و مذہب کی کشمکش ہے۔ سرمایہ داری اور ملوکیت جیسے مستبدانہ ادارے ہمیشہ مذہب کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ مذہب جو مفاد پرستوں کی عقلِ فریب کار کا تراشیدہ بت ہے اور اس کی گرفت کا راز یہ ہے کہ اپنے عمل و منشا کو خدا سے وابستہ کر دیتا ہے اور عوام کے جذبات کی تہذیب کرنے کی جگہ انہیں مشتعل کرتا رہتا ہے — مذہب ہے کیا؟

تجھ- سود خور، والی و مُلّا و پیر

کے مسلک کا نام ہے۔ یہ مسلک جو عہدِ نوح علیہ السلام سے عہدِ مصطفویؐ تک خدا کے دین سے برسرِ پیکار رہا اور آج بھی یہ ستیزہ کاری جاری ہے۔ اسی مذہب نے انسانوں کے سروں کو بادشاہوں کے سامنے جھکایا ہے اور یہی پیشوائیت یا تو لادینی حکومت سے خوش رہتی ہے یا پھر مذہبی حکومت سے جہاں قیصر کا حق قیصر کو ملے اور ملّا کا حق مُلّا کو۔

پرویز صاحب نے جب اپنے خطاب میں مذہب پرستوں کے ہاتھوں "خدا کے استعمال" کا ذکر کیا تو مجھے یاس یگانہ چنگیزی کا یہ نشتر رگ دل میں اُترتا ہوا محسوس ہوا ؎

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
تو بندگانِ ضرورت کا آفریدہ سہی!

دوسرا نکتہ میرے ذہن میں یہ آیا کہ انسانی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ "مذہب" ہے اس خاکدانِ تیرہ میں جب انسان نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا تو اپنے سے قوی تر افراد کو "نیم خدا" قرار دیتے ہوئے ان کے آگے سر جھکایا تھا — مگر عہدِ تہذیب میں مذہب ہی نے بادشاہ کو "ظلِ سبحانی" بنا کر انسانوں سے اس کی پرستش کرائی۔

دین و مذہب کے فرق کو اپنے خطاب کے ایک مرحلہ میں پرویز صاحب اس حسن مدرانی کے ساتھ پیش کیا کہ اپنی زبان سے میری محبت کچھ اور بڑھ گئی۔ مدتوں جس زبان سے گل و بلبل اور نگارانِ سمن بر کے فسانے سنا کر محفل کو سلائے رکھا تھا اسی زبان کو سرسید اور ان کے رفقاء نے جرسِ کاروانِ بیداری بنا دیا۔ اور آج پرویز اسی زبان کے ذریعہ قرآنی معارف کو پیش کر رہا ہے اور شمعِ مذہب " کو بجھا کر خورشیدِ دین " کا نشان ہمیں دے رہا ہے۔

" دین، عقل کے روغن سے زندگی کی راہوں کو جگمگاتا ہے، عوام کو دلائل و براہین کے پیچھے چلاتا ہے۔ خوف کو شرک قرار دیتا ہے۔ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی دعوت دے کر ابنِ آدم کو تقدیر شکنی سکھاتا ہے۔ دین زندگی کا تبسّم ہے۔ مذہب موت کی سسکی ہے۔ مذہب دین کے الفاظ، اصطلاحات اور رسوم و مناسک کو قائم رکھتا ہے مگر ان سے روح چھین لیتا ہے۔"

یہ خطاب کیا تھا ایک ایسا ہمہ گیر اور کل شناس آئینہ تھا جس میں دین کا ہر دل نواز خط نکھر کر سامنے آگیا۔ اور مذہب کا سارا میک اپ اتر گیا۔ یہ مذہب ہی تو ہے جو "عائلی قوانین" کے خلاف شور و غوغا مچا رہا ہے لیکن عصمت فروشی زناکاری اور دو بالغوں کے درمیان رضاکارانہ مگر ناجائز جنسی تعلق کے باب میں مہر بلب ہے۔ اسی مذہب ہی نے جداگانہ قومیت کو تسلیم کرنے کے باوجود تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے عبداللہ ازبک والئی ترکستان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ یہ مولوی اور عالم فرماں روائی میں اپنا حصہ چاہتے ہیں (دین کی خدمت ان کا مقصود نہیں)۔ اکبر کے الفاظ کی صداقت آج بھی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

بارہ بجے یہ خطاب ختم ہوا۔ کتنے ہی لوگ شہر سے آئے تھے، وہ دوبارہ شام کو آنے کے لئے رخصت ہوئے۔ مندوبین و مبصرین نے اس تقریر کے نکات پر بڑی دیر تک گفتگو کی --- دوپہر کے کھانے پر بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔

نمازِ جمعہ اور مندوبین

کھانے کے بعد ہم لوگ مختلف ٹولیوں میں جمعہ کی نماز ادا کرنے قریب کی مسجدوں میں گئے۔ میں اچھرہ کی مسجد میں پہنچا۔ طلوعِ اسلام کنونشن کا بیج سینہ پر آویزاں تھا۔ جب وضو کر رہا تھا تو چند نگاہوں نے یوں گھورا کہ سینہ کی خباثتیں آنکھوں میں آگئیں --- میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہے۔ اوکاڑہ کا سانحہ یہاں بھی اپنے آپ کو دہرائے --- مگر مسلمانوں کا خون جو حرمِ کعبہ سے کم مقدس نہیں، رائیگاں نہ جائے گا۔

نماز کے لئے صف میں کھڑا ہوا۔ ایک صاحب بولے۔ "پرویزی ہو"؟ اس کے جواب میں عرض کیا جماعت کھڑی ہو رہی ہے نماز کے بعد عرض کروں گا" --- اور نماز کے بعد میں مسجد سے انہیں کے ساتھ باہر نکلا۔ اور عرض کیا کہ جناب ہم اور آپ اس دین سے وابستہ ہیں جس نے ہمیں "مسلم" کا نام دیا ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو محمدی بھی نہیں کہتے تو بھلا کسی دوسرے انسان سے اپنے آپ کو کیسے وابستہ کر سکتے ہیں ورنہ اپنے دین کا نام رکھنے کے لئے حضور سے زیادہ محترم اور مقدس ذات اور کون سی ہو سکتی تھی جس کی ترکش سے خدا کا تیر چلتا تھا۔" --- میں نے انہیں طلوعِ اسلام کا مسلک تفصیل سے بتایا۔ ذہنی تعصبات

گوارا نہ تھا، چنانچہ وہ شام کے اجلاس میں نظر آئے۔

پھر ایسا ہی واقعہ محترم عزیز قریشی صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا ـــ وہ شاہ جمال کالونی کی مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے تو چند لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ـــ "تو سامنے آج پرویزیوں نے بھی ڈیرہ ڈال رکھا ہے"۔

ـــ "سنا ہے یہ لوگ تین ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں"۔

ـــ "اور تو اور ـــ عام مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے"۔

عزیز قریشی نے آگے بڑھ کر کہا ـــ "آپ کی اصطلاح میں تو میں بھی پرویزی ہوں مگر آپ کے ساتھ ہی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا ہوں"۔

میں نے اس سے پہلے پرویز صاحب سے کہا تھا کہ ہم جمعہ کی نماز کنونشن کے پنڈال میں کیوں نہ پڑھیں ـــ اور انہوں نے مخالفت کی تھی کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا، فرقہ پرستی کو ہوا دینا ہے ـــ اس وقت ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی ـــ مگر ان دونوں واقعات کے بعد بڑے دکھ کے ساتھ میں یہی سوچتا رہا کہ بہتان و تہمت طرازی کو بھی کیا یہ پیشوایان دین متین "اپنے دین" کا جز سمجھتے ہیں۔

دوسرا اجلاس

شام کو ۴ بجے کنونشن کا دوسرا عام اجلاس شروع ہوا۔ میاں عبدالخالق کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ میاں عبدالخالق جنہیں گزشتہ رات میں نے عالم خواب میں کراہتے سنا تھا مگر جو بیدار ہونے کے بعد ایک لمحہ کے لئے آرام کے تصور سے بھی ناآشنا ہیں ـــ یہ دبلا پتلا آدمی کتنی قوی روح رکھتا ہے اپنے ناتواں جسم میں ـــ میاں صاحب کو دیکھ کر اس حقیقت پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوئی ذاتی زندگی نہیں ـــ اور جنہیں مقصد کی حرارت ہی زندہ رکھتی ہے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد میرزا خلیل صاحب نے اقبالؒ کا نغمہ حجازی چھیڑا۔ مرزا خلیل کو خطاب کے موضوع کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب کرنے کا جو ملکہ حاصل ہے اس کا تذکرہ شاید میں پہلے ہی کر چکا ہوں ـــ آج کا موضوع تھا "جنگ اور انسان" ـــ اور میرزا خلیل اقبال کے یہ اشعار پڑھ رہے تھے ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب

کلامِ اقبالؒ کے بعد میاں عبدالخالق نے پرویز صاحب کو خطاب کی دعوت دی ۔۔ وہ اسٹیج پر آئے ۔ حاضرین کی خدمت میں سلام و رحمت کا ہدیہ پیش کیا اور پھر گلِ افشانیٔ گفتار یوں شروع ہوئی ۔

۔۔۔ "انسان بھی اک طرفہ تماشا ہے ۔ اسے عبادت گاہوں میں محوِ عبادت دیکھ کر آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں ۔ اور اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو مہر و ماہ و انجم پر کمندیں ڈالتا ، زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینہ میں ڈھالتا ہوا نظر آتا ہے ۔ لیکن یہی انسان جب نشۂ نخوت میں چڑھا بیٹھے جیسے انسانوں پر پھرتا ہے تو آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ایوانِ تمدن خاک بسر نظر آتا ہے ۔"

ادب کے طالب علم کے نقطۂ نظر سے اس تمہید کو دیکھئے تو ہر لفظ بقول غالبؔ "گنجینۂ معنی کا طلسم" نظر آتا ہے اور قرآن کے آئینے میں دیکھئے تو "احسنِ تقویم" اور "اسفل السافلین" کی گرہ کھل جاتی ہے ۔ آدمی تو ایسا محشرِ خیال و عمل ہے کہ ہر تضاد اس کی ذات میں جمع ہو جاتا ہے ۔

اس حسین و نظر نواز و دل کشا تمہید کے بعد پرویز صاحب نے بتایا کہ علم و فن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی تخریب کاری کس طرح بڑھ رہی ہے اور جنگ کے خوف سے سہمی ہوئی اس دنیا کے لئے قرآن کے دامن میں امن کی کیسی نویدِ جانفزا ہے ۔ یہ دین جس کا نام ہی اسلام ہے ۔ جنگ کے خلاف سب سے بڑی ضمانت ہے ۔ قرآن فساد کو بدترین لعنت قرار دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ کی سلامتی سے کسی کو کھیلنے کی اجازت بھی نہیں دیتا ۔ پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ حسن کارانہ انداز میں برائی کو بھلائی میں بدلنے کی کوشش کی جائے ، لیکن اگر ضروری ہو تو سزا دی جائے مگر سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے کیونکہ عدل ایک مستقل قدر ہے ۔ ظلم کا بدلہ لینا ظلم نہیں ہے بلکہ تقاضائے عدل کو پورا کرنا ہے اور اس تقاضے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حصولِ قوت لازم ہے ۔ مسلمان تو ہر مظلوم کی حمایت کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہے ۔

ان تصریحات کے بعد پرویز صاحب نے فلسفۂ جہاد اور شرائطِ جہاد کو قرآن کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ، اور قرآن کی روشنی ہی میں بحث کی تکمیل یوں کی کہ جہاد کا مقصد اول و آخر یہی ہے کہ ایسا معاشرہ وجود میں آئے جہاں جنگ کا امکان ہی نہ ہو ۔ اور جنگ ۔ اپنے ہتھیار رکھ دے " ۔۔۔ یہ بات نظریاتی وحدت کی بنیادوں ہی پر ممکن ہے ۔

میں نے اسلام کے بڑے بڑے نکتہ دانوں کے ہاتھوں پر ذکرِ جہاد کے ساتھ پسینہ دیکھا ہے اور گفتگو میں معذرتی انداز ۔۔۔ لیکن پرویز صاحب کی تقریر "اپالوجی" نہ تھی ۔ فلسفۂ جہاد کی تفسیر تھی ۔۔۔ دین پر یہ استحکام اور ایمان قرآن کے چشمۂ آبِ حیات کے سوا کسی اور سے نہیں مل سکتا ۔ وہ چشمۂ آبِ حیات جس کی ہر بوند اسوۂ حسنۂ نبویؐ کے سانچے میں ڈھل گئی ۔۔۔ وہ دین جسے ہر دین پر غالب آنا ہے ، جسے انسانی تفرقوں کو مٹانا ہے جسے ہر انسان کو مجبوراں

باطل کے استبداد سے نجات دینا ہے.... وہ جگہ جگہ دیں بھی نظر آئے گا۔

تیسرا اجلاس

متفرق خطابات

رات کو ۹ بجے تیسرا اجلاس شروع ہوا۔ یہ اجلاس مندوبین کی تقاریر و مقالات کے لئے مخصوص تھا۔ یہ اجلاس میرے خیال میں اپنا احتساب یا امتحان ہے.... اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم دوران میں اپنے مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کتنی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔ ذوقِ نظر تو ہمارے دور میں متاعِ ارزاں ہے۔ لیکن اشیاء کی حقیقت کو پرکھنے والی نظریں کتنی ہیں؟

اس اجلاس کی صدارت عزیز قریشی صاحب نمائندہ راولپنڈی نے کی۔ وہ اپنے فرائض اس چوکسی سے ادا کر رہے تھے کہ پنڈال میں بیٹھے ہوئے ہر شخص پر ان کی نظر تھی۔ کوئی کرسی پر پہلو بھی بدلتا تو انہیں ناگوار گزرتا۔

زندگی کے ہر عمل اور ہر لمحہ کو مقاصدِ جلیلہ کے لئے وقف کر دینا انگاروں پر چلنا ہے۔ زندگی کے ہر لمحہ کو اپنی گرفت میں لینے کو جی چاہتا ہے ــــ اور پھر آج رات کے صدر کو تو یہ خیال مضطرب کر رہا تھا کہ تین دن کے لئے تو ہم جمع ہوئے ہیں، پھر آرام یا ذہنی جمود کا کوئی لمحہ آئے کیوں؟

ڈاکٹر عبدالودود کا خطاب

سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے مسئلہ پاکستان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی دل سوزی سے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا کہ "اللہ کی حکومت کا نعرہ تو ہم بلند کرتے ہیں مگر محض جذباتی طور پر ــــ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ نے اپنی حکومت کے کیا خدوخال ہمیں اپنی کتاب کے ذریعے عطا کئے ہیں ــــ اور انہیں خطوط پر اسلامی ریاست کی تشکیل پنڈت نہرو اور مغربی نظریۂ قومیت کے چیلنج کا واحد جواب ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسلامی ریاست کی خصوصیات کو تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور قوم میں عسکری روح کی تخلیق پر زور دیا۔

راجہ محمد اکرم کی تقریر

راجہ محمد اکرم کے مقالہ کا عنوان تھا۔ "سفر یا آوارگی ہے ــــ کتنا معنی آفریں عنوان۔ ایک جائزہ ــــ ایک نوحہ ــــ انہوں نے سچ کہا کہ جب بھی کسی قوم نے یا خود ہم نے تعینِ منزل کے بغیر قدم اٹھایا تو بھٹکتے رہے۔ اور جب منزل کا تعین کر لیا تو بامراد منزل پر جا پہنچے۔ اکرم صاحب وکیل ہیں اور اچھے وکیل کی طرح انہوں نے اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں کو منطقی ربط سے روشن کر دیا۔ اسلوب اتنا رواں اور ادیبانہ تھا کہ میں نے بھی اس لمحہ شدت کے ساتھ رشک محسوس کیا۔ ویسے یہ عرض کر دوں کہ ایسے لمحے میری زندگی میں کم ہی آئے ہیں۔ ؎

کہاں خاکساری پہ یہ سینے پہ دائیاں حسرت!

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

خان عبدالحکیم کا خطاب

راجہ محمد اکرم کے بعد خان عبدالحکیم خان نے "دنیا میں جنتی زندگی" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ عرب کے بدوکی طرح سرحد کے پٹھان کا ذہن بھی "صراطِ مستقیم" ہوتا ہے۔ پٹھان ذہنی جمناسٹک کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ قصۂ زمین برسرِ زمین "طے کرتا ہے۔ خان عبدالحکیم خان نے اپنے مقالہ میں بتادیا کہ مومن کے لئے تو یہاں بھی جنت ہے اور وہاں بھی۔ ان کا مقالہ قرآنی آیات کے درخشاں موتیوں کا جگمگاتا ہار تھا۔ وہ آیات جن کا انداز جنتِ ارضی کے بارے میں اتنا واضح ہے کہ ان کے دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

مقالوں کی یہ مجلس گیارہ بجے کے قریب ختم ہوئی —— اور لوگ تھے کہ مزید مقالے سننے کی تاب رکھتے تھے مگر ضابطہ کی پابندی اس کے راستے میں حائل تھی۔

اجلاس کے بعد

اجلاس کے خاتمہ پر "آرام گاہ" میں "سینہ چاکانِ چمن" نے باتیں کیا شروع کیں۔ یوں سمجھئے کہ اپنے داغ ہائے جگر کی نمائش کی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جنہیں نہ آرام کی فرصت ہے نہ نیند کی —— یہ کیسی بیتاب روحیں ہیں جن کے سوز و گداز کی کوئی حد نہیں —— یہ کیسی نگاہیں ہیں جو رات کے اندھیروں کا جگر چاک کر کے اجالوں کو قریب تر لا رہی ہیں —— یہ کیسے دل ہیں جو دوسروں کے لئے دھڑکتے ہیں — رات بیتی جا رہی تھی ... آخر نیند کی پری شبنم کے جھولے میں بیٹھ کر آئی اور اس کے لمس نے ان بے خواب نگاہوں کو لذتِ خواب سے ہم کنار کر دیا۔ ... دور کہیں گھڑیال نے دو بجنے کا اعلان کیا اور میں نے دیکھا کہ پنڈ دادن خاں کے عبدالرحیم خان اور ان کے ساتھی پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ اس لئے جاگ رہے ہیں کہ دوسرے سکون کے ساتھ سو سکیں۔ ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا۔ کسی صندوق میں کوئی تالا نہ تھا۔ کسی کو اپنے سامان کی فکر نہ تھی —— کاش وہ دن ہمارے جیتے جی آئے جب گھروں کے دروازے کھلے ہوں اور کسی رہزن کا اندیشہ بھی ذہن میں نہ آئے —— مگر ہم تو اس دور سے گزر رہے ہیں جہاں خیالات و جذبات پر بھی ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔

۱۳/ اپریل کی صبح

رات اور صبح کے درمیان دو تین گھنٹے ہی تو حائل تھے اور پھر مؤذن کی آواز فضاؤں میں ابھری۔ اذان جو مسلمانوں کا منشور ہے —— اعلان جو نظامِ صلوٰۃ اور خیر و برکت کی طرف بلاتا ہے۔ یہ اذان جس پر تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں مگر بقولِ جوشؔ اس میں —— کہ

محمدؐ کا اب تک دھڑکتا ہے دل

—— اسی اذان ہی سے تو شبستانِ وجود لرز اٹھتا ہے۔ فراعین کے چہرے بے نور ہو جاتے ہیں ؎

وہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز　　نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

— اب اس بدنصیبی پر تو کائنات کی آنکھوں میں آنسو لرزتے ہیں کہ اذان تو باقی رہ گئی اور وہ روحِ بلالیؓ رخصت ہوگئی۔ کبھی وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل گونجتی تھی اور کہاں اب خدا کی جگہ غلافِ کعبہ کی پرستش اصل دین ٹھہری ہے۔

ذہن بھی کیا چیز ہے۔ شاعروں کو کیوں الزام دیں کہ قیامت کے ذکر کا دامن کسی کی جوانی سے باندھ دیتے ہیں۔ اور لب و گیسو کی حکایت کو دار و رسن تک پہنچا دیتے ہیں — ہاں تو اذان کے ساتھ بیداری کی ایک لہر آئی۔ عبدالرحیم خاں نے تو رات کو صبح ہوتے ہوئے دیکھا۔ میرے بزرگ "رجل اللیل" کہلاتے تھے۔ چپکے سے میں نے یہ خطاب عبدالرحیم خان کی طرف منتقل کردیا۔

نمازِ سحری کے بعد لوگ چائے خانہ میں جمع ہوگئے۔ جمیل صاحب چائے خانے کے منتظم تھے۔ ادھر آپ نے آواز دی اور ادھر لب ریز و لب سوز و لب بند چائے حاضر ہوگئی — میں نے کہا بھئی کہ بھئی اتنی شکر کیوں ڈالتے ہو؟ — جواب میں کہنے لگے ہم "تلخیوں کے بیچ شیرینی کے بیوپاری ہیں"۔

مندوبین کا اجلاس

ساڑھے آٹھ بجے مندوبین کا اجلاس شروع ہوا۔ تجاویز سے پہلے مولانا عبدالرب صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ کبھی مولانا استاد تھے۔ پیشے کے اعتبار سے کتنے ہی لوگ معلم ہوتے ہیں جو اپنے لہجے سے "تھانیدار" معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا عبدالرب کو تو قسامِ ازل نے ایسا لب و لہجہ عطا کیا ہے کہ ان کی بات برگِ گل پر شبنم کا موتی معلوم ہوتی ہے۔ دھیمی دھیمی آواز جیسے دل شاعر میں الفاظ و معانی کا نزول ہو رہا ہو۔

مولانا عبدالرب کا خطاب

عبدالرب صاحب نے آج کے پاکستانی معاشرہ کے ذہنی تضاد کو کیسے حسن کارانہ انداز میں ایک جملہ میں سمو دیا۔ "آج معاشرہ کی مقرر کردہ حدود کو مانا جاتا ہے اور حدود اللہ کو صرف پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔"

مولانا عبدالرب نے آزاد دنیا کے آزاد معاشرہ اور اشتراکی معاشرہ کا تجزیہ بڑی عمدگی کے ساتھ کیا۔ آزاد معاشرہ جہاں فرد کی آزادی قائم ہے مگر بنت نئی الجھنوں کے دروازے کھل گئے ہیں۔ کہیں دولت کی افراط ہے اور کہیں نانِ شبانہ تک نہیں۔ اور اشتراکی معاشرہ جہاں فرد کی اہمیت مشین کے پرزے سے زیادہ نہیں — دونوں نظریئے اور معاشرے انسانیت کُش ہیں۔ تیسرا معاشرہ وہ ہے جو وحی الٰہی قائم کرتی ہے اور رسول اکرمؐ نے عملاً قائم کرکے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ وہ معاشرہ جس میں ہر فرد اور پورا معاشرہ دوسروں کو بہتر آدمی بنانے کے لئے محنت لیتا ہے اور جہاں مفید کام وہی ہے جس سے انسانیت کو نفع پہنچے۔

مولانا عبدالرب نے اس معاشرہ کے قیام کے سلسلے میں بتایا کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی کا رُخ کیسے بدلنا ہوگا؟ "ذی القربیٰ" کا ترجمہ انہوں نے "آس پاس والے" کیا۔ ایسا برجستہ، بامعنی اور حسین ترجمہ سُن کر "سبحان اللہ"

کی آوازیں فضا میں گونج گئیں۔

مولانا عبدالرب کی تقریر کے بعد پرویز صاحب نے ڈائس پر آکر ان کی خدمت میں تاثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ اگر پرویز صاحب کی مختصر تقریر کو یہاں دہرادوں تو شاید عبدالرب صاحب مجھ سے روٹھ جائیں ــــ وہ ان میں سے ہیں جنہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلہ کی پرواہ۔

تجاویز

مولانا عبدالرب کے مقالے کے بعد تجاویز کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختلف بزموں کے نمائندے آتے اور اپنی تجاویز پیش کرتے۔ تجاویز کا محور ایک ہی تھا۔ یعنی قرآنی پیغام کی ترویج و اشاعت ــــ سال بھر یہ لوگ اپنے مقامی حالات کے پیش نظر اسی مسئلہ پر غور کرتے رہتے ہیں اور اپنی فکر کو عمل بنانے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ کتنے ہی پہلو نظر کے سامنے آتے ہیں۔ کے پھوٹیں کے اپنائیں۔ قوت فیصلہ کی بے چارگی ..... اے معاذ اللہ۔ صدیوں کی راہ ایک دن میں طے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پشاور کے مرزا علی احمد صاحب تجاویز کا پورا دفتر ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس بزم کے سیرو دہی تھے ــــ ہمہ تن اضطراب۔ ہمہ تن سیماب۔ پرویز صاحب بھی محفل میں موجود تھے، مگر خاموش تماشائی کی حیثیت سے ــــ ادھر ہماری دینی مجلسوں اور بزموں میں آمریت کے جو مظاہرے نظر آتے ہیں ان سے تو آپ بھی بے خبر نہیں۔ استقامت دین کے نام پر ہمراہیوں کے قلب و نظر کو مجروح کیا جاتا ہے اور کسی "میثاق" کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں ہوتی۔ نتیجہ ؟ ــــ کارواں سے راہیوں کا ٹوٹ جانا ــــ اور آمران دین کا اپنی وعدہ خلافیوں کے سلسلے میں ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان لگانا (خداوندا! محمد مصطفیٰؐ کے دامن عصمت سے کھیلنے والوں کے ساتھ ہمارا حشر نہ کرنا۔ الحذر سو بار الحذر)۔ تجاویز طلوع اسلام کے اس شمارہ میں کسی جگہ درج کی گئی ہوں گی۔ اس لئے میں تفصیلات سے دامن کشاں آگے بڑھتا ہوں۔

ایک اہم مذاکرہ

تین بجے سہ پہر کو کنونشن کا نہایت اہم مذاکرہ شروع ہوا۔ مذاکرہ کا موضوع تھا۔

ــــ "ہمارے نوجوانوں کے مسائل"

تین بجے سے بہت پہلے طلباء طالبات اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد پنڈال میں جمع ہو چکی تھی۔ کنونشن کے مندوب کھڑے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ ہمارے ماہرین تعلیم، مصلحین قوم اور ارباب دانش، دین سے نوجوانوں کی بیزاری اور گریز کا ہر دم ماتم کرتے ہیں۔ لیکن یہ اجلاس اس ماتم کے جھوٹ کو بے نقاب کر رہا تھا۔ ہمارا نوجوان "ملّا کے مذہب" سے بھاگتا ہے، خدا اور محمدؐ کے دین نہیں ــــ وہ تو اپنی خالی آنکھوں اور ویران دل کے ساتھ اس دشت ہستی میں سایہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور جب وحی الٰہی اس کے کانوں تک پہنچتی ہے تو جیسے یہ تھکا ہارا مسافر کسی نخلستان میں

پہنچ جاتا ہے۔

یہ مجمع سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کا مجمع تھا۔ (طاہرہؓ وہاں ہوتی تو اپنے اتنے بھر اوّں کو دیکھ کر ربّ العزت کے حضور نہ جانے کس انداز سے اظہارِ تشکر کرتی۔)

پرویز صاحب نے اس مذاکرہ کا آغاز اور اس کے حدود کا تعین کیا۔ انہوں نے فرمایا:

"یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قوموں کی تقدیر ان کی اُبھرنے والی نسل کے ماتھے پر لکھی ہوتی ہے۔ جیسے آج کے نوجوان، ویسی کل کی قوم۔

" قیامِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام نے اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس کیا اور بار بار اس کا اظہار کیا۔ طلوعِ اسلام نے اربابِ حل و عقد سے مطالبہ کیا کہ ایک طرف تو آپ بیرونی اور اندرونی خطروں کے خلاف اس سرزمین کے تحفظ کا بندوبست کریں اور دوسری طرف ہمارے نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام اس آئیڈیالوجی کے مطابق کیجئے جس نے پاکستان کو جنم دیا ہے۔ اس طرح قوم قرآنِ حکیم کے نظریہ کے مطابق ڈھل جائے گی۔

"اس مطالبہ اور نہایت بنیادی کام کو نظر انداز کیا گیا اور آج یہی رہنمایانِ قوم شکوہ کرتے ہیں کہ قوم، بالخصوص قوم کے نوجوان برائیوں کی پوٹ ہیں۔ شکوہ کرنے والے کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ آخر اس صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟ — ہم تو اپنے نوجوانوں کو یوں موردِ الزام قرار دے رہے ہیں۔ جیسے ان کی الجھنوں کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

"آج نوجوانوں میں جو اضطراب پایا جا رہا ہے اس کی وجہ ناقص اور غیر قرآنی نظامِ تعلیم ہے۔ پھر طرفہ ستم یہ کہ مذہبی طبقہ نے نوجوانوں کو مردود قرار دے کر دھتکار دیا ہے اور معاشرہ فیصلہ دیتا ہے کہ آج کے نوجوانوں میں نہ شرافت ہے نہ نجابت، نہ شوخیٔ فکر نہ پستیٔ کردار — مذہبی گروہ اور معاشرہ کے صاحبانِ اقتدار کو ان نوجوانوں پر تنقید کا حق ہی کب حاصل ہے۔

؎ اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

"میرے پیغامِ قرآنی کے اوّلین مخاطب یہی نوجوان رہے ہیں جن کے سینوں کی گہرائیوں میں جھانک کر ہم نے ان کے مضطرب جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی تمناؤں اور آرزوں کی شدت کو سمجھنے کی سعیٔ پیہم کی ہے۔

آج اس محفل میں قوم کے نوجوان آپ کے سامنے اپنے دل کی باتیں کہنے آئیں گے۔ ان کے مسائل اور مشکلات پر ہمدردی کے ساتھ غور کیجئے اور انہیں حل کرنے کے راستے نکالیے۔"

لہ پرویز صاحب کی سب سے پہلی طاہرہ بیٹی۔ بیگم کشفی۔ ام عاکف۔ آہ جسے اب مرحومہ لکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے (طلوعِ اسلام)

"پہلے طالب علم اپنے مسائل کو پیش کریں گے۔ ان میں سلیم بیٹے بھی ہوں گے اور طاہرہ بیٹیاں بھی۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن کی تعلیم ابتدا سے انتہا تک انگریزی زبان میں ہوئی ہے یہ بھی تو ایک قومی المیہ ہے جس کا شکار ہماری نوجوان نسل ہوئی ہے۔ ان کے لئے اردو میں اظہار کتنا مشکل ہے۔ مگر یہ کوشش کریں گے اور آپ دیکھیں گے کہ خلوص اور شدت فکر و جذبہ اس مرحلے کو کس طرح آسان بنا دیتی ہے۔ صرف دو مقرر انگریزی میں تقریر کریں گے اور اس کے لئے وہ معذرت خواہ ہیں۔

• طالب علموں کے بعد استادوں کے نمائندے آپ کو یہ بتائیں گے کہ انہیں آج کے طالب علموں کے ساتھ کیا مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ استادوں کے بعد والدین ان مرحلوں کو پیش کریں گے جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کے سامنے آتے ہیں؟"

اس تمہیدی وضاحت کے بعد مذاکرہ شروع ہوا۔ طالب علم اپنے مسائل کو پیش کر رہے تھے۔ یا یوں کہئے کہ اپنے (بلکہ ملت کے) داغ و ارجم اور روح کے ہر زخم کو نمایاں کر رہے تھے۔ اور چارہ سازوں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ "غنچہ کھلا کیا جند"

طلبار کے مقالات

سب سے پہلے گورنمنٹ کالج کے منیر غضنفر نے اس بات کا تجزیہ پیش کیا کہ نوجوانوں کے دلوں میں بزرگوں کا احترام کیوں باقی نہ رہا۔ اس عزیز نے کتنے کرب کے ساتھ کہا کہ والدین پر بچہ کا اعتماد اس کے ساتھ ساتھ جوان نہیں ہوتا ہے، بلکہ بڑھا ہوتا چلا جاتا ہے — وجہ؟ — "وہ دن بچہ کی زندگی کا نہایت اہم موڑ ہوتا ہے۔ جب ماں باپ اس سے پہلا جھوٹ بولتے ہیں" — منیر غضنفر کا یہ تجزیہ بڑا منطقی تھا، اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مغربی تہذیب نے ہمیں چاہے کچھ اور نہ دیا ہو لیکن سائنسی طریقۂ فکر ضرور دیا ہے۔"

اس کے بعد ریحانہ داؤد نے اساتذہ اور طلبا کے باہمی رشتہ پر اظہار خیال کیا۔ یہ مسئلہ آج کے سنگین ترین تعلیمی مسائل میں سے ہے۔ کل کی بات تھی کہ طالب علم خدمت استاد کے عوض ہدیۂ دل پیش کرتا تھا اور آج سبق کے بعد استاد سے کہتا ہے کہ "بل پیش کیجئے" یہ بات تشویشناک ہے۔ مگر معاشرہ کے رجحانات اور طالب علموں کے رویہ کے ساتھ استادوں پر بھی اس کی ذمہ داری کچھ کم نہیں ہے۔ ریحانہ داؤد نے اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات پیش کئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک استاد کا کام کتابی معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ اپنے طالب علموں کی مضمر صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ طلبار کی شخصیت کی تعمیر استاد و طالب علم کے چند گھنٹوں کے رابطہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ زندگی بھر کا کام ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی کھلا ہوا ورق ہو جسے دونوں پڑھ سکیں۔

انجنیئرنگ یونیورسٹی کے جاوید رحیم نے طلبا کے معاشی مسائل کو پیش کیا۔ یہ مسائل جو زمانۂ طالب علمی کو بھی مسموم بناتے ہیں اور طالب علمی کے بعد بھی متوسط اور غریب نوجوانوں کو ڈستے رہتے ہیں۔ — غریب طالب علم ڈگریوں کے سہانے مستقبل کے سہانے خواب دیکھتے ہیں مگر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور نتیجہ؟

مایوسی۔ حسد۔ رشک اور تخریب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ۔ یہی وہ نفسیاتی کشمکش ہے جس سے نجات دلانا معاشرہ کا فرض ہے"۔

اور پھر کینیرڈ کالج کی نسیم عالم زیب آئیں۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا۔ "طالب علم اور پاکستان" ——

نسیم عالم زیب نے مقالہ انگریزی میں پڑھا۔ انگریزی تلفظ نہایت اچھا۔ لہجہ کا اتار چڑھاؤ ایسا کہ مفہوم اُبھرتا جائے —— بڑی بات یہ کہ دو ٹوک باتیں —— کہیں کسی رعایت کا سوال نہیں ۔ تشویشناک ہیجانات، سیاسی عدمِ استحکام، کا ذکر اور ان سے طالب علموں کا متاثر ہونا —— ہندوستان اور پاکستان کی قیادت کا بے رحمانہ موازنہ اور اس حقیقت کا اعلان کہ "آج اگر نوجوانوں کو پاکستان کی نظریاتی بنیادوں سے وابستگی نہیں ہے تو یہ دوری ان کے بزرگوں کے خیالات اور رجحانات کا عکس ہے"۔

طلبا و طالبات کے ان مقالوں میں فکر بھی تھی۔ اور روح کی بے چینی کا اظہار بھی۔ ان کی قدرے چست پتلون کو دیکھ کر "ٹیڈی بوائے" کہہ دینا تو آسان ہے مگر ان کے دل میں ہل چل مچانے والے جذبات سے آنکھیں ملانا بہت مشکل ہے۔ دو چار صدیوں کی غلامی کے بعد نوجوانوں کی پریشان نظری کے مظاہر تو عام ہیں، مگر ہمیں اس کا مداوا تلاش کرنا ہے۔ حقارت کے ساتھ "ٹیڈی بوائے" اور "ٹیڈی گرل" کہہ کر ہم انہیں جیسے دھتکار دیتے ہیں —— اپنی روایات سے کچھ اور دور کر دیتے ہیں۔ ویسے منیر غضنفر، ریحانہ داؤد، جاوید رحیم اور نسیم عالم زیب کی تقریریں اور مقالے سن کر اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ ؎

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں

—— مسلمان اس علمی جمود کے گرداب سے بہر حال نکل چکا ہے —— جہاں حاشیہ نگاری منتہائے علم و فضل تھی —— کسی نئے فکر کا گزر نہ تھا۔ درسگاہوں میں ... حاشیوں پر حاشیئے لکھے جا رہے تھے۔ مگر آج کے نوجوان مسائل کی تہ تک جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اپنے معترضین کے بارے میں کہہ سکتے ہیں ؎

کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید   آشکارم دید و پنہانم نہ دید

اساتذہ کے خطابات

طلبا کے بعد اساتذہ کی باری آئی۔ محترمہ زاہدہ منظور کا موضوع تھا۔ "تعلیم کا مقصد" زاہدہ منظور اور ایسے ہی دوسرے لکھنے والے اور بولنے والے اردو کی ہمہ گیری کا نشان ہیں۔ زاہدہ منظور کا مضمون سنتے ہوئے یہ خیال ایک لمحہ کے لئے ذہن میں نہ آیا کہ یہ خاتون "پنجابی" ہو سکتی ہیں۔ ہم اہلِ زبان ترستے ہوئے لہجے کو اپنی میراث جانتے ہیں۔ مضمون میں گہرائی بھی تھی اور وہ شوخی بھی جو نسوانی لہجہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مضمون کا پہلا ہی جملہ ملاحظہ ہو —— یہ جملہ ہی بتا دیتا ہے کہ لکھنے والی کو بات کہنے کا سلیقہ ہے۔

• زندگی کے مسائل عام طور پر خوشگوار نہیں ہوا کرتے۔ لیکن تعلیم کا بذاتِ خود ایک مسئلہ بن جانا کچھ زیادہ ہی

تشویشناک امر ہے"۔

اس کے بعد محترمہ نسیم الوّاتیں۔ مقالہ کا موضوع تھا "طلبا اور مذہب"۔ میں جانتا ہوں کہ انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا نسیم صاحبہ کے لئے بڑی کرب ناک بات ہے لیکن میں اسے برا نہیں سمجھتا۔ اسلام اور قرآن کے آفاقی پیغام کو ہمیں ہر زبان میں پیش کرنا ہے۔ مغرب کا خلا اس پیغام کا منتظر ہے۔ نسیم الوّر نے اپنے موضوع کے ہر پہلو کو تفصیل سے پیش کیا۔ اور کئی ایسی باتیں کہ گئیں جو ہمارے گہرے غور و فکر کی مستحق ہیں مثلاً "ہمارا طالب علم ہمارے قول و فعل کا آئینہ ہے"۔

"ہمارے نوجوان شاید تمام روایتی اداروں سے بغاوت کر دیں۔ لیکن معاشرہ اور خاندان کی معاشی بالادستی کی وجہ سے مجبور ہیں"۔

"آج اسلام کو دوسرے مذاہب کی پست سطح پر پیچھے لایا جا رہا ہے"۔ نسیم الوّر صحیح معنوں میں معلم ہیں اور لاہور کے اساتذہ و طلبا میں دین کی تعلیم کی جو ہر نئے دائرے بنانی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اس کی تخلیق میں ان کا حصہ دوسروں سے کہیں زیادہ ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ اس مقام پر کشفی صاحب نے اپنے مخلصانہ انکسار کی وجہ سے' جو ان کی درویشی کا ایک جزوی جزو بن چکا ہے اپنا تذکرہ (روئداد میں) نہیں کیا۔ پروگرام کے مطابق اساتذہ کی نمائندگی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن کشفی صاحب بھی تو اسی زمرہ میں شریک ہیں (وہ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں) وفورِ شوق سے اٹھے اور صاحبِ صدر کی اجازت سے چند الفاظ میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے لئے مائیکروفون کی طرف بڑھے۔ کشفی صاحب کے قلم کی سحر آفرینی سے حلقۂ طلوعِ اسلام عرصہ سے متعارف متاثر ہے لیکن ان کی گفتار کی جادو بیانی سے ہم میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ہم نے انہیں پہلی بار مائیک پر دیکھا تھا انہوں نے جب لب کشائی کی تو ساری فضا پر سکوت چھا گیا۔ الفاظ ہیرے کی طرح ترشے ہوئے۔ فقرے موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے مضمون فکر آفریں۔ انداز سحر آگیں۔ وہ چند منٹ سے زیادہ مائیک کے سامنے نہیں رہے ہوں گے کہ پھر اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ لیکن سامعین میں سے ہر ایک محوِ حیرت تھا کہ

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

اس سے آگے داستان' پیر کشفی صاحب کی زبانی سنئے۔ طلوعِ اسلام)۔

والدین کی ترجمانی

اساتذہ کے بعد والدین کی نمائندگی میرزا محمد خلیل صاحب اور محترمہ حمیدہ بانو (بیگم الوّر) نے کی۔ خلیل صاحب نے والدین کے فرائض اور مسائل کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا اور والدین کے مختلف رویوں (ATTITUDES) کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کر دیا۔ اور حمیدہ بانو تو "ماں" کا ایک صحیح مجسمہ تھیں۔

اس مجلس مذاکرہ کا عام معیار اتنا بلند اور فضا اتنی سنجیدہ تھی کہ ہمارے ملک کی ہر علمی انجمن اور ادارہ اس معیار پر رشک کر سکتی ہے۔ میں نے اقبال اکادمی کی سالانہ تقریبات میں بھی شرکت کی ہے اور مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ جیسے اقبال نوازی کے پردے میں اقبالؒ سے کسی بات کا بدلہ لیا جا رہا ہے ــــ میں نے تدریسی و تعلیمی کانفرنسوں میں بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم کو بغیر کسی تیاری کے بولتے سنا ہے۔ ایسی فی البدیہہ تقاریر جن میں مدعا مفقود ہوتا ہے۔ اس مجلس مذاکرہ میں کسی طالب علم مقرر نے سچ کہا تھا کہ

آج ذمہ داری سے بچنا ہر شخص کا محبوب مشغلہ بنتا چلا جا رہا ہے۔

مجلسِ استفسارات

رات کو ساڑھے ۹ بجے مجلسِ استفسارات " شروع ہوئی۔ غالباً یہ مجلس سالانہ کنونشن کے ایک مستقل ضمیمہ (سکشن) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی افادیت سے بھلا کون انکار کرے گا۔ پرویز صاحب کے خطابات تو ہر سال دو تین مخصوص موضوعات پر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتنے ہی سوالات رفیقوں کے ذہنوں میں نشتر کی طرح چبھتے رہتے ہیں اور وہ اس ساعت کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان سوال کرنے والوں میں وہ حضرات بھی ہوتے ہیں جو بقولِ خود " پرویز صاحب کو آکورڈ پوزیشن میں ڈالنا چاہتے ہیں — ایسے سوالات ہمیشہ اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ "موسیقی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے "؟ آپ فلم کیوں دیکھتے ہیں"؟ کیا آپ تین نمازیں پڑھتے ہیں"؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج کی مجلس کے لئے شمار سوالات موصول ہوئے تھے۔ پرویز صاحب نے ڈھائی گھنٹوں میں ستائیس سوالوں کے جوابات دئے۔ ہر جواب مختصر لیکن مکمل — اگر ضد نہ ہو اور کج بحثی نہ ہو تو یہ جواب کسی مزید وضاحت سے بالاتر ہیں۔ وقت کی تنگی اور سوالات کی تعداد کے پیشِ نظر جواب دینے سے پہلے پرویز صاحب نے اس بات کو واضح کر دیا کہ انہیں سوالوں کے جواب دئے جائیں گے جو اہم ہوں۔ جن کا عملی زندگی سے تعلق ہو۔ اور جن میں فرقہ واریت نہ ہو۔ پرویز صاحب نے واضح الفاظ میں یہ بات ایک بار پھر کہہ دی کہ " میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ سہو سے بالاتر ہے اور حرفِ آخر ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ بھی براہِ راست کتابِ حکیم کا مطالعہ کریں اور قرآن کی بارگاہ میں خود پہنچ جائیں "۔

مجھے پتہ نہیں کہ اس مجلس کے سوالات اور جوابات کو ادارہ طلوعِ اسلام پیش کر رہا ہے یا نہیں۔ احتیاطاً چند اہم سوال اور ان کے جواب پیش کر رہا ہوں۔ اگر ادارہ نے اس مجلس کی روئداد مرتب نہ کی تو کسی دوسرے شمارہ میں ناچیز یہ قرض بھی ادا کر دوں گا۔

سوال : امریکہ اور روس کے نظام میں سے کون سا نظام بہتر ہے؟

جواب : اونٹ سے کسی نے پوچھا کہ چڑھائی بہتر ہے یا اتار؟ — اس نے کہا " برہردو لعنت "۔ قرآن کا نظام دونوں سے مختلف ہے۔ وہ ان میں سے کسی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا ۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول !

سرمایہ دارانہ نظام نے خدا کو ظہریہ (EXTRA) بنا رکھا ہے جس کے نام کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ورنہ اگر کسی کا خدا پہ ایمان ہو تو اس کا نظام غیر خدائی خطوط پہ کیسے قائم ہو سکتا ہے ؟

سوال :۔ مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم بڑے بڑے علما کی موجودگی میں کیسے رائج ہوگئیں۔

جواب :۔ جدید کہن کو چھوڑیئے۔ پیچھلے بیٹھے ہی جو رسم پیدا ہوئی ہے یہ کیسے پیدا ہوگئی۔ تواتر کے بعد یہی رسم "دین" میں شامل ہو جائے گی۔ دین ہمیں عقل و براہین کے پیچھے چلاتا ہے اور مذہب عوامی جذبات کے پیچھے چلتا ہے ؎

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات ہبل کے جیسے زمانے میں پھر سے آتے ہیں

سوال : جسٹس منیر نے کہا ہے کہ بینک کا سود "ربٰو" نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب : میرا خیال نہ پوچھئے۔ قرآن کا نقطہ نظر پوچھئے۔ سود کا مسئلہ عرصہ سے الجھا ہوا ہے۔ "بینک کا سود جائز ہے" "ناجائز ہے" ، "کمرشیل سود جائز ہے" "ناجائز ہے"۔ یہ مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں اور پھر یہ سوال کہ بین الاقوامی تجارت اور بینکنگ کا کیا ہوگا ؟

آپ اسلامی نظامِ معیشت کا غیر اسلامی نظام کے ساتھ پیوند لگائیے۔ "ربٰو" کا ترجمہ "سود" اور "INTEREST" کرنا ہی بنیادی غلطی ہے۔ ہم عجیب تضاد کے دور سے گزر رہے ہیں۔ کسی کسان کو ہزار روپے قرض دے دے اور دس روپے زائد لے لئے یہ حرام ہے۔ لیکن زمین خود خرید لی اور کسان کو بٹائی پر دے کر اس کی محنت کے ثمرے سے خود لطف اندوز ہوئے ، یہ حلال ہے۔ اور پھر "سلیپنگ پارٹنرشپ"۔ جی ہاں۔ انگریزی میں کہہ دیا تو حلال ہوگیا۔ "ربوا" کے معنی ہیں بڑھوتی — اور قرآن کا فیصلہ ہے۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ

ڈھائی گھنٹے میں پرویز صاحب نے ۲۷ سوالوں کے جواب دئے۔ قرآنی نقطہ نظر، علمی بصیرت اور برمحل و بامو قع مزاح کے مختلف سوالوں کو جیسے کسی ایک لڑی میں پرو دیا۔ ویسے بھی زندگی ایک وحدت ہے — ایک اکائی — ہمہ رنگی میں یک رنگی۔ کثرت میں وحدت — یہ ہے زندگی — زندگی کے مسائل بھی حقیقت شناس ذہنوں سے تابندگی و شگفتگی نہیں چھین سکتے۔ ذہن کی یہی تابندگی مزاح کہلاتی ہے۔ ایمان سے کہئے گا کبھی کسی مولوی کو بھی آپ نے مسکراتے دیکھا ہے؟ — ذہن کے تجسس کے لئے مزاح زلف و کم خواب کی نزاکت کا درجہ رکھتا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مذہب مُلّا و فقیہ میں زلف و کم خواب حرام ہیں۔ وہ انسان جو آگہی کا باب اور مقصودِ عرش ہے۔ وہ بے چارا حُسن کارانہ زندگی بسر کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔

اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ پرویز صاحب کو قرآن پر کس قدر عبور ہے۔ فطرت نے ان کی نگاہ میں کس قدر وسعت، ذہن میں کس قدر جودت اور الفاظ پر کس قدر قدرت عطا کی ہے تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ ان کی ایک مجلسِ استفسارات میں شریک ہو جائیں اس کے بعد انہیں کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

آخری کھلا اجلاس

۱۴- اپریل- کنونشن کا آخری دن ہے۔ شام ہوتے ہی یہ رفیقانِ چمنِ قرآن، وطن عزیز کے مختلف حصوں کی طرف ایک تازہ تر جذبۂ عمل کے ساتھ رخصت ہو جائیں گے۔ اور یہ فضائیں ایک سال تک ان کا انتظار کرتی رہیں گی۔

صبح ۹ بجے کھلا اجلاس شیخ محمد شفیع صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ شفیع صاحب جو اس تحریک کے مقدمۃ الجیش میں بھی دوسروں سے آگے ہیں ــــ بہتوں سے بعد میں اس کارواں میں شامل ہوئے اور عزم کی طرح کتنے ہی مقامات سے آگے نکل گئے۔ کراچی خوش نصیب ہے کہ اس کی تاجرانہ فضا میں شفیع، محمد حنیف، حافظ برکت اللہ۔ ملک عبداللہ۔ ملک عبدالوحید۔ مولانا عبدالرب۔ اسلام۔ قاسم بھائی۔ ابراہیم بھائی۔ علاؤالدین۔ شیخ محمد انور، وزیر محمد، ملک سعید۔ لطیف الرحمٰن صدیقی۔ شیخ رحمت اللہ جیسے لوگ ــــ ایک فرد کی طرح قرآنی افکار کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کی رفتارِ عمل کو دیکھئے تو ایسا لگتا ہے جیسے قوم کسی شدید ہنگامی دور سے گزر رہی ہے۔ اور یہ احساس کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ سفینۂ فکر و نظر کیسے غیر اسلامی گرداب میں پھنسا ہوا ہے!

شیخ محمد شفیع صاحب کا صدارتی خطاب

اس طویل جملۂ معترضہ کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ تلاوت کلام پاک کے بعد شفیع صاحب نے تحریک طلوع اسلام کے بارے میں خطبۂ صدارت پڑھا۔ کہنے کو تو اس خطبہ کا موضوع یہ تحریک قرآنی تھی لیکن شفیع صاحب نے برصغیر کی فکری و دینی تاریخ کو نہایت اختصار کے ساتھ یوں پیش کیا کہ ہر اشارہ اپنی تفصیل آپ بن گیا۔ قرآنی تحریک کے خد و خال کو نمایاں کیا اور اپنے ہم سفروں کو آواز دی کہ تیز ترک گامزن ــــ خدا کے کائناتی قانون کے رفیق بن جاؤ تاکہ صدیاں دنوں میں بدل جائیں۔

سید نصیر شاہ صاحب مائیک پر

ہاں ایک بات کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا تھا۔ شفیع صاحب کے خطبۂ صدارت سے پہلے نصیر شاہ صاحب آئے۔ ان کے ترجمے تو آپ نے طلوع اسلام میں پڑھے ہوں گے۔ قمیص اور شلوار میں ملبوس یہ سیدھا سادا پنجابی جوان ایسا "بندہ صحرائی" ہے جو فطرت کے اشاروں کو سمجھتا ہے۔ اردو لکھتا ہے تو ٹکسالی۔ عربی لکھتا ہے تو ایسی کہ عالم عرب کے عالم بھی "عجمی" نہیں کہہ سکتے۔ نصیر شاہ صاحب نے طلوع اسلام کے لئے علامہ السید احمد السیفی کے مقالات کا ترجمہ کیا اور دوسری طرف انہوں نے پرویز صاحب کے ابوسلیم کے نام ایک خط (قانون سازی کے بارے میں) کا عربی میں ترجمہ کر کے علامہ سیفی کو بھیجا اس ترجمہ کو پڑھ کر علامہ سیفی نے جو خط نصیر شاہ صاحب کو لکھا تھا انہوں نے اس کا ترجمہ پیش کیا۔ علامہ سیفی مدت تک مجلہ "الدین" کے مدیر رہے ہیں اور اب ادارۂ فقہ العصر کے ڈائرکٹر ہیں۔ نصیر شاہ صاحب نے جب خط کا ترجمہ سنایا تو کتنی ہی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے علامہ سیفی اس محفل میں خود موجود ہیں۔ علامہ سیفی اور پرویز صاحب کا طرزِ استدلال متعدد موضوعات پر ایک سا ہے اور بقول نصیر شاہ صاحب

"اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر روایات اور ذاتی رجحانات سے بلند تر ہو کر قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے تو ایک ہی سے نتائج مرتب ہوں گے۔"

علامہ السیفی کا خراج تحسین

علامہ سیفی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر آپ نے پرویز صاحب کے مضمون کا لفظی ترجمہ کیا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ قرآن عزیز کی رفاقت میں گزارا ہے۔ کفر کے فتوؤں سے بددل ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ شمع حق کے پروانے جل کر خاک نہیں ہو جاتے بلکہ وہ شعلوں سے بھی کھیلتے ہیں۔ اور ان کا پیرہن بھی محفوظ رہتا ہے اور پھر پرویز صاحب تو اس منزل پر کھڑے ہیں جہاں دنیا کی عظمتیں انہیں للچائی ہوئی نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ آج پرویز کسی فرد واحد کا نام نہیں ہے بلکہ ہماری حیات اجتماعی کے ضمیر کا نام ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب

تبلیغ صاحب کے خطبہ کے بعد پرویز صاحب خطاب کے لئے آئے۔ آج کے خطاب کا موضوع تھا "انسان کے بنیادی حقوق"۔ اس خطاب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ انسان نے مختلف ادوار میں اپنے لئے کیا حقوق مانگے۔ انسانوں نے انسان کو کیا حقوق دئے۔ اور قرآن کیسے اہم، عظیم اور انسانیت ساز حقوق عطا کرتا ہے۔ قرآنی ریاست کا معاہدۂ عمرانی یہ ہے کہ انسان اپنی جان و مال خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور خدا اسلامی معاشرہ کے ذریعے انسانوں کو "الجنۃ" سے نوازتا ہے۔ اس اصطلاح میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کی انسان آرزو کرتا ہے۔

اسلامی ریاست میں انسانوں کے اہم بنیادی حقوق کی ایک ایک کر کے پرویز صاحب نے تشریح کی۔ یہ حقوق کیا ہیں؟ "احترام آدمیت" "جنسی مساوات" "اعمال و کردار کی بنیاد پر مراتب کا تعین" "حق آزادی" "حق محنت" "عدل" "احسان" "رزق کا حق" "جان اور عصمت کا تحفظ" "حق نکاح" "ذوق جمال کی تسکین" "مذہبی آزادی" "سچی بات کہنے کا حق" "مظلوم کو فریاد کرنے کا حق" "سائلوں کی حفاظت کا حق" "حیثیت عرفی کا حق" اور "خوف و حزن سے آزادی"۔ ایک ایک شق پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ وحی الٰہی انسانوں کے راستوں کو کس طرح منور کرتی ہے۔ انسان تجربات سے گزرتا ہوا اس منزل تک آیا ہے کہ چند بنیادی حقوق کا اسے احساس ہوا ہے۔ مگر "ذوق جمال کی تسکین" "عدل" "احسان" اور ایسے ہی کتنے حقوق ابھی تک اس کی ذہنی دسترس سے باہر ہیں — ان کی تفصیل پرویز صاحب کے خطاب میں ملاحظہ ہو جو غالباً اس اشاعت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پرویز صاحب کے اس خطاب کو سنتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے کان آنکھیں بن گئیں جو قرآنی معاشرہ میں ان حقوق کو محسوس طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اور جیسے "لیلائے حق" محمل تقریر میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ پرویز کا کمال نہیں قرآن حکیم کا اعجاز ہے۔ جو اپنے وابستگان دامن کو اپنے کرم بے حساب سے نوازتا ہے۔ قرآن کی بارگاہ میں اپنے دل کو لوح سادہ کی طرح پیش کرنے والوں کو خدائے ذوالجلال اس مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں ان کی فکر سے ہر گوشۂ حیات، دامان باغبان و کف گل فروش کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ اور زندگی کے موسم میں ان کی تحریر و تقریر سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآنی افکار کی ادنیٰ سی چوٹ آدمی کو علم و فکر کا شہریار بنا دیتی ہے۔ اور ہر لفظ میں مکتب خیال کی وسعتیں سمٹ آتی ہیں۔

ذرہ میں صحرا اور قطرہ میں دجلہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ کانٹے جلوۂ گل کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز یہ انداز نظر ہی تو ہے جو افکار کو جنم دیتا ہے ؎

نوع دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن اپنے طالب علموں اور عاشقوں کو اس سطح بلند پر پہنچا دیتا ہے جہاں ان کے بارے میں بے ساختہ زبان کہہ اٹھتی ہے کہ ؎

آہ از جہاں نواز ترنم جہاں حشر ہوز
تیور تمام سازِ تکلم تمام سوز
دانش بہ دو نہفتہ، نظر مہر نیم روز
تقریر فہم باف، خموشی خیال دوز

یہی وہ کتابِ عظیم ہے جس نے حضور سرورِ کائنات ؐ کی زبانِ مبارک کو وحیِ الٰہی کا لباس کامل بنا دیا تھا اور سقراط و ارسطو عرب کے اس "اُمی" کے مکتب کے "طفلِ ناداں" معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وہ کتابِ مقدس ہے جس نے عربوں کو علوم و فنون کی نشاۃ الثانیہ کا وسیلہ بنا دیا۔

الوداعی اجلاس

اس پچھلے اجلاس کے تھوڑی دیر بعد مندوبین و مبصرین کا الوداعی جلسہ منعقد ہوا۔ ہر شخص دوسرے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی صورت دل کے پردے پر اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میاں عبدالخالق الوداع کہنے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن گریہ یوں گلوگیر ہوا کہ انہیں کرسی پر بیٹھنا پڑا۔

مالی ایثار کا ولولہ انگیز مرحلہ

نہ جانے یہ الوداعی جلسہ کس مبارک گھڑی شروع ہوا کہ ایک ایسی تجویز سامنے آئی جس سے اس تحریکِ قرآنی کی تاریخ کا ایک نیا اور درخشاں باب شروع ہوگا۔ مرزا محمد خلیل صاحب نے طلوعِ اسلام ہال اور مرکز کی تعمیر کی تجویز پیش کی — ایسا مرکز جس کے ہال میں اجتماعات منعقد ہو سکیں، جو ایک قرآنی درسگاہ کو اپنے دامن میں جگہ دے سکے اور جہاں کنونشن منعقد ہو سکیں۔

ماجد محمد اکرم نے ایک ہزار روپے پیش کئے۔ آسمان جیسے بارش کے اسی پہلے قطرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اور پھر تو بارش شروع ہوگئی۔ پانسو۔ ایک ہزار۔ پندرہ سو۔ پانچ ہزار۔ مختلف اطراف سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ رفتار میں ذرا کمی آئی تھی کہ پھر بارش کے اس پہلے قطرہ نے ایک ہزار کی رقم کا اضافہ کر دیا۔ وہ کام جو بہت مشکل نظر آتا تھا وہ جیسے عمل کے دائرہ میں داخل ہوگیا۔ جذبات کا عالم نہ پوچھئے۔ تعاون کی اس دوڑ میں نہ بے تعلقی کا خیال کسی ذہن میں نہ تھا۔ چند لمحات میں

قرآنی کالج کی بنیاد' دفیٹ رکھنے کا سامان آنکھوں کے سامنے جمع تھا۔

اور جب یہ مرحلہ تمام ہوا تو پرویز صاحب اپنے رفیقوں کو الوداع کہنے کھڑے ہوئے۔ ان کی الوداعی تقریر کو اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

پیرِ مغاں کا الوداعی پیغام

"میری صحت ویسے تو کبھی تسلی بخش نہ تھی لیکن اس جنوری کی ایک رات کو جب موت محسوس شکل میں اپنے سرہانے کھڑی نظر آئی تو میری آرزوئیں بے بس نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ آرزوئیں جو تین تھیں۔ پہلی آرزو مفہوم القرآن کی تکمیل، دوسری آرزو آپ سے ایک بار پھر ملنے کی تمنا اور تیسری آرزو ایک درس گاہ کا قیام، جسے میں مدت سے اپنے دل میں پال رہا ہوں۔ ایک ایسی چھت کی خواہش جس کے تلے میں اپنے قوم کے بچوں کو لے کر بیٹھ سکوں اور قرآنی خطوط پر انہیں تعلیم دی جا سکے۔ ان بچوں کے ساتھ میری یہ محبت جذباتی نہیں ہے۔ آپ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کل کر چکے ہیں۔ اگر ہم ان کی تربیت صحیح کا انتظام کر سکیں تو یہ کائنات کس طرح جگمگا اٹھے۔

"میں اس تمنا کو ہونٹوں تک دلاتا تھا کہ شاید یہ ہماری بساط سے بڑھ کر ہے مگر آج آپ نے اس تمنا کو حقیقت میں بدلنے کا آغاز کر دیا ہے۔ میں اپنی اس سعادت پر جس قدر ناز کروں کم ہے کہ آپ جیسے رفیق مجھے نصیب ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں ایسی درسگاہ کا قیام عمل میں آئے گا جو اس دور میں قرآنی فکر کا مینارہ نور ہو گی۔ آپ جب اگلے سال تشریف لائیں گے تو دیکھیں گے کہ آپ کا عزم، عمل کے مرحلوں سے کس تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔

اچھا رفیقو! الوداع۔ آپ جا رہے ہیں۔ خدا حافظ! میں سال بھر آپ کے نقوشِ پا سے باتیں کرتا رہوں گا۔

کنونشن سے چند دن پہلے جب میں ۲۹ ویں پارے کا مفہوم لکھ رہا تھا تو وہ آیت قرآنی سامنے آئی جس میں حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ جب تم قرآن ان کے سامنے پیش کرو گے تو یہ آنکھیں نکال کر اور یوں گھور کر دیکھیں گے کہ تم اپنے مقام سے پھسل پڑو۔ یہ ہے ان کی تمنا۔ لیکن جب تم استقامت کے ساتھ اپنے مقام پر کھڑے رہتے ہو تو یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو دیوانے ہیں۔

"رفیقو! ایسی دیوانگی پہ ہزار فرزانگی نثار۔ ہم اس دیوانگی کو اپنی نجات کے لئے سند سمجھتے ہیں۔ اس نعمت سے اللہ کے عظیم ترین رسول کو نوازا گیا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں بھی اس سنتِ نبوی کے اتباع کی سعادت نصیب ہوئی۔

بیادرانِ من! آپ کے لئے میرا الوداعی پیغام یہی ہے کہ قرآنِ حکیم سے ایسی شیفتگی پیدا کیجئے کہ لوگ آپ کو دیکھ کر کہہ اٹھیں — "یہ ہیں قرآن کے دیوانے"۔ شعائرِ اسلام اور ارکانِ اسلام کو اختیار کیجئے۔ یہ ارکان "قیامِ نظامِ صلوٰۃ" کا اشارہ ہیں۔ یہ ہمیں اپنے مقصدِ جلیلہ کی ہر دن یاد دہانی کراتی ہیں۔

اللہ آپ کو سیرت اور کردار کی وہ بلندی عطا فرمائے کہ آپ کے کردار سے معاشرہ اسلامی رنگ میں ڈوب جائے۔

ربِ ذوالجلال والاکرام آپ کی آرزوں کو کامگار فرمائے ۔

پرویز صاحب کی تقریر کے بعد میاں عبدالخالق نے دوستوں کو الوداع کہا۔

یوں طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن ختم ہوئی ــــ یہ کنونشن جو آٹھویں کنونشن کا پیش خیمہ ہے۔ جس نے قرآنی درسگاہ کو خیال سے عمل کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جس کی تقریریں اور خطابات چراغِ راہ کی طرح روشنی دکھاتے رہیں گے ــــ اس کنونشن پر اس تبصرہ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ ؎

ان میں لہو ہمارا جلا ہو کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

(ابو عاکف کشفی)

قراردادیں

قرارداد نمبر ۱

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس شیخ محمد انور صاحب کی خدمت میں بخلوص قلب ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہے کہ انہوں نے کنونشن گاہ سے ملحق اپنے بنگلے کو کنونشن کی ضروریات کے مطابق استعمال میں لانے کی پیشکش فرمائی۔ اور اس طرح کنونشن کیلئے بہت سی سہولتیں مہیا کردیں۔

قرارداد نمبر ۲

یہ اجلاس کنونشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس کی روز و شب کی مسلسل جدوجہد نے کنونشن کے جملہ انتظامات کو حسن و خوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور کنونشن میں شریک احباب کے حسب ضرورت ہر قسم کی آسانیاں پیدا کیں۔

قرارداد نمبر ۳

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بزمہائے طلوعِ اسلام کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اس سالانہ اجتماع کو کامیاب بنانے کے لئے پورے تعاون کا ثبوت دیا۔ اور توقع کرتا ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں وہ آئندہ بھی اپنے تعاون اور سرگرمیوں کو اسی جذب و شوق سے جاری رکھیں گے۔

قرارداد نمبر ۴

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بزمہائے طلوعِ اسلام کی طرف سے آمدہ تمام رضاکاروں کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اپنی شبانہ روز اور بے لوث خدمات سے کنونشن کو نوازا اور دن رات بپا یہ ان انتظامات کی تکمیل میں کوشاں رہے جو ان کے سپرد کئے گئے۔

قرارداد ۵ طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس میاں عبدالخالق صاحب آنریری مینجنگ ڈائریکٹر میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کو ان کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں جو انہوں نے قرآن حکیم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں سرانجام دی ہیں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے۔

قرارداد ۶ طلوع اسلام کنونشن کا یہ اہم اور نمایندہ اجلاس پوری سنجیدگی سے محسوس کرتا ہے کہ طویل انتظار کے بعد اب وہ وقت آگیا ہے جب کہ دیرینہ آرزو کے برآنے کا سامان پیدا کرتے ہوئے ایسی درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے جہاں مروجہ علوم کے ساتھ ہماری نئی نسل کے قلب و نگاہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تربیت پا سکیں اور ان کی سیرت و کردار ان اقدار میں ڈھل سکیں جو دین خداوندی کی اصل و اساس ہیں۔

کنونشن اس درسگاہ کے ساتھ ایک ہال کی تعمیر کو بھی اشد ضروری سمجھتی ہے۔ جہاں درس قرآن اور اس نوعیت کے دیگر اہم اجتماعات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

اس عظیم منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ حضرات آگے بڑھیں جو طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر و نظام سے متفق ہیں۔ اور اس کے بعد وہ ملک کے دیگر مخیر حضرات سے اپیل کریں کہ وہ اس بلند مقصد کے حصول کے لئے ہم سے فیاضانہ تعاون کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے تعاون سے یہ منصوبہ جو پاکستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

قتلِ مرتد غلام اور لونڈیاں

جیسے اہم عنوانات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو مدت سے نایاب تھی۔ اس کی مانگ بہت زیادہ تھی اب اُسے مُصنّف کی نظرثانی کے بعد نئے ایڈیشن کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی ہے جلد فرمائش بھیج دیجئے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

مفکرِ قرآن — کی تحقیقِ مسلسل اور کاوشِ پیہم کا

بے مثال شاہکار

انسان نے کیا سوچا؟

عہدِ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر تک انسانی فکر کن دشوار گزار مرحلوں کو طے کرتی ہم تک پہنچی۔ ایک عبرت آموز روئیداد —

ایک علم افروز داستان —

ایک بصیرت انگیز تجزیہ —

ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین

فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔

(• — نوائے وقت لاہور)

یہ کتاب نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ۴۰۰ صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے۔

(• — قندیل ویکلی لاہور)

قیمت ۱۲ روپے

میزان پبلیکشنز لمیٹڈ - ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

استقبالیہ

(میاں عبدالخالق صاحب صدر کنونشن کمیٹی)

برادرانِ عزیز! پچھلے سال کنونشن ختم ہو جانے کے بعد جب آپ احباب تشریف لے گئے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اتنی بڑی ذمہ داری سے بخیر و خوبی سبکدوش ہوا تو ایک عزیز دوست نے، جو بہت ذمہ دار بھی ہیں، ایک تقریر شروع کی کہ — چونکہ اس کنونشن کے انتظامات بہت عمدہ رہے ہیں اس لئے ——— میں اس پر خوش ہوا کہ لگاتار سونے کا تمغہ ملنے۔ لیکن انہوں نے اپنا فقرہ یوں پورا کیا کہ --- چونکہ کنونشن کے انتظامات بہت عمدہ رہے ہیں اس لئے طے کیا جاتا ہے کہ آئندہ سال کنونشن کمیٹی کے صدر بھی میاں عبدالخالق ہی رہیں — اب میں یہ سوچتا ہوں کہ جب اس مدرسے کا آئین یہ ہے کہ ——— اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا ——— تو اس مرتبہ مجھے کوشش کرنی چاہیئے کہ کنونشن کے انتظامات تسلی بخش نہ ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یہ بھی نہیں ہو سکے گا۔ مشکل یہ ہے کہ میرے رفقاء بھی میرا ساتھ نہیں دیتے۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں کیا کروں۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

مقصدِ عزیز کا صدقہ کچھ بھی ہو یہ ایک خوشگوار فرض ہے کہ ساتویں سالانہ کنونشن کی تقریب پر میں آپ احباب کو خوش آمدید کہوں۔ اور دور دراز کا سفر اختیار کر کے آپ نے اس اجتماع کو کامیاب بنانے کی جو سعی فرمائی ہے اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ مجھے ان جذبات و احساسات کا بخوبی علم ہے جو اس کنونشن کے انتظار میں آپ کے دلوں میں ابھرتے رہتے ہیں اور جب اس کے انعقاد کا اعلان ہوتا ہے تو آپ کی شدتِ انتظار ناقابلِ برداشت کیفیت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس مقصدِ عزیز کا صدقہ ہے جو شاہراہِ حیات کی تاریکیوں میں آپ کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یعنی قرآن کا وہ سراجِ منیر جس پر

صدیوں سے مفاد پرستیوں کے دبیز پردے پڑے تھے اب آپ کے ہاتھوں اس کی نقاب کشائی کے امکانات روشن ہو رہے ہیں اور زمانہ ایک بار پھر اس کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ ور ہونے کی ساعت قریب پا رہا ہے۔ اس لئے میرے عزیز و خوش نصیب ساتھیو آپ کو مبارک ہو کہ یہ گرانمایہ سعادت آپ کے حصے میں آئی ہے۔ اور اسی کے زندگی بخش تقاضے ہیں جو سال بہ سال آپ کو کشاں کشاں اس کنونشن میں لے آتے ہیں تاکہ اس روشنی کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کے لئے آپ مل جل کر نئے پروگرام ترتیب دیں اور وہ کام کر جائیں جو پوری نوعِ انسانی کو عالمگیر مشکلات سے بچا کر قرآنی انقلاب کی تابناک فضاؤں میں لے آئے۔

یقین فرمائیے کہ کنونشن کمیٹی اس سالانہ اجتماع کی اہمیت اور آپ کی حسین آرزوؤں سے پوری طرح باخبر ہے اور اس نے اس تقریب پر آپ کے لئے ایسا ماحول مہیا کرنے کی پوری سعی و کاوش کی ہے جہاں شایانِ شان ربطِ باہمی سے کام لے کر آپ مستقبل کی راہوں پر اپنے سفر کو کامیاب بنانے کی منصوبہ بندی کر سکیں۔

کنونشن گاہ کا انتخاب

محترم احباب! آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے سال کے استقبالیہ میں میں نے گلبرگ کے دوستوں سے یہ عرض کیا تھا کہ اس سالانہ تقریب کے لئے ایسا وسیع و عریض مکان پیشِ نظر رکھیں جس پر (سالِ گزشتہ کی کنونشن گاہ کی طرح) چھتیں تو پڑ چکی ہوں لیکن ابھی وہ اس کے مکینوں کی رہائش کے قابل نہ قرار پایا ہو۔ گلبرگ میں اگر ایسی جگہ میسر آ جاتی تو ہم حسبِ سابق اُسے آسانی سے استعمال میں لے آتے۔ لیکن جب وقت آیا تو گلبرگ کے دوست ایسے مکان کی نشاندہی نہ کر سکے۔ اس لئے کہ جن لوگوں کے مکان ناتمام حالت میں تھے انہوں نے (شاید) یہ دیکھ کر کہ کنونشن قریب آ رہی ہے، دن رات ایک کر کے اپنے مکانات کی تکمیل کر لی۔ سوچئے کہ آپ کنونشن کی کون کونسی برکات کو جھٹلائیں گے؛

اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمیں دور دور تک نگہِ انتخاب دوڑانی پڑی اور جوئندہ یابندہ کے مصداق بالآخر ہمیں اپنے مقصد کے لئے یہ مناسب مقام مل ہی گیا۔ میں ان حضرات کا بخلوصِ قلب شکر گزار ہوں جنہوں نے یہ جگہ اور اس سلسلہ میں ضروری سہولتیں مہیا کیں اور شاہ جمال کالونی کی اس کھلی فضا میں ہم اپنی سالانہ بزم آراستہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس کے لئے محترم شیخ محمد انور صاحب سب سے بڑھ کر شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہر ممکن سہولتیں پہنچانے کی پیش کش کر دی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہ کرم فرما محترم شیخ محمد شفیع صاحب کے عم زاد برادر ہیں۔ کیوں نہ ہو یہ تو پورے کا پورا گھرانہ ہی قرآن کا شیدائی ہے۔

رفقائے عزیز! یہ پہلا موقع ہے کہ ہماری کنونشن کھلی فضا میں منعقد ہو رہی ہے۔ کھلی فضا کی بہاروں کا تو پوچھنا ہی کیا لیکن موسم کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے بارش کا خطرہ وجہِ پریشانی تھا۔ اس کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وسیع خیموں کے اندر ہوا اور فرش پر بستر بچھائے جائیں۔ لیکن شیخ محمد انور صاحب کی کشادہ ظرفی نے ادھر بھی اطمینان کی صورت

پیدا کر دی - انہوں نے فرمایا کہ بارش کی صورت میں ان کا مکان حاضر ہے گا - مل جل کر گزارہ کر لیں گے - اس لئے پھر پہلی تجویز کو برقرار رکھا کہ رہائش کھلے شامیانوں کے نیچے ہو جو باہمی رابطہ ایک جگہ رہنے سے پیدا ہو سکتا ہے وہ خیموں کی مکڑیوں میں بٹ جانے سے کہاں ممکن تھا - اب جو اس ملحقہ بنگلے کے استعمال کا اذن عام حاصل ہو گیا ہے تو اس کے بعد موسمی صورت حال سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا - ہم نے آپ کے آرام و آسائش کی ہر ممکن صورت پیش نظر رکھی ہے - اس کے باوجود اگر آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہو تو مجھے آپ کی فراخدلی اور جذبۂ اخوت سے یہ امید کرنی چاہیئے کہ اس کے لئے آپ ہمیں معاف کر دیں گے -

تعاون کا شکریہ

سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی کنونشن کے جملہ انتظامات کی ذمہ داری بزم طلوع اسلام لاہور کے سپرد تھی - ان احباب نے انتظامات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دن رات ایک کئے رکھا - ان میں سے بعض نے تو اپنا کاروبار تک اس جنون میں تیاگ دیا اور شب و روز دیوانوں کی طرح کنونشن کی تیاریوں میں وقف کار رہے - ان احباب کے نام لے کر میں ان کے خلوص کو داغدار نہیں کروں گا - اور نہ ہی وہ ایسی شہرت کے طالب ہیں لیکن میرے لئے یہ امر ضروری ہے کہ ان احباب کی گرانقدر سعی و کاوش کے لئے ان کا شکریہ ادا کروں - علاوہ بریں میں ان معزز ہمدردان تحریک کا بھی سپاس گزار ہوں جنہوں نے کنونشن کے وسیع اخراجات کے پیش نظر دل کھول کر مالی امداد و تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور اس طرح ہماری بہت سی پریشانیوں کو خوشگوار اطمینان سے بدل دیا - ان احباب کی فیاضانہ سرپرستی ہمیشہ ہماری تحریک کو ممنونِ احسان رکھے گی اور ہر قدم پر ہم ان کے بیش بہا تعاون کے آرزومند رہیں گے - ان احباب نے میری مالی تعاون کی اپیل کو خوش آمدید کہا لیکن بعض احباب ایسے بھی ہیں جنہوں نے جواب میں ابھی تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے - میں ان کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہوں - لیکن اُن کی خاموشی میرے لئے وجہ پریشانی ہے - وہ اب بھی میری اپیل کا جواب دے سکتے ہیں -

میں اپنے فرض میں کوتاہی کروں گا اگر اس موقع پر کراچی کے اس ایثار پیشہ دستے کا شکریہ ادا نہ کروں جو حسب سابق اس دفعہ بھی کنونشن کمیٹی کا ہاتھ بٹانے کے لئے کئی روز پہلے ہی لاہور پہنچ گیا - انہیں ایثار پیشہ کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایثار کو اب اپنا مستقل پیشہ بنا لیا ہے - بالفاظِ دیگر انہوں نے کسب ہی یہ پکڑ لیا ہے کہ ہمیشہ یہی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہے کوئی کنونشن کرانے والا - اللہ مسبب الاسباب ہے - ان کا کام بن ہی جاتا ہے - ایسا پیشہ خدا ہر ایک کو نصیب کرے - ہماری کنونشن کے یہ طائرانِ پیش رس کئی دن پہلے سے یہاں پہنچ کر ہماری سالانہ تقریبوں کی رونق کو دوبالا کر دیتے ہیں - اور اپنے حسنِ تجویز اور حسنِ عمل سے اسے وہ دل کشی عطا کر دیتے ہیں جو ان کے بغیر شاید ممکن نہ ہو - کنونشن کمیٹی ان احباب کو مخلوص قلب خراجِ تحسین پیش کرتی ہے -

سالہائے ماسبق میں شرکائے کنونشن کو پندرہ روپے فی کس اپنے قیام و طعام کے سلسلے میں داخلہ کے طور پر ادا کرنے پڑتے تھے اور اس کے باوجود کافی خسارہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ لیکن بعض احباب کی مالی بیچارگی اس رقم کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔ چنانچہ کنونشن کمیٹی نے خسارے کے باوجود رقم داخلہ گھٹا کر دس روپے فی کس کر دی۔ اس سے خسارہ مزید بڑھ گیا ہے لیکن کنونشن میں شرکت کے آرزومند احباب کو داخلے کی آسانیاں ضرور مہیا کر دی گئی ہیں۔

پروگرام میں ضروری تبدیلی

اس موقع پر مجھے یہ عرض کرنے کی بھی مسرت حاصل ہے کہ گزشتہ سالوں کے مقابلے میں اس بار کنونشن کے پروگرام میں بعض ضروری تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ اب ایک نشست نمائندگان کے مقالوں اور تقریروں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور ایک دوسری نشست میں مذاکرہ کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ اس نشست میں کالجوں کے طلباء، پروفیسر زادر والدین، "ہمارے نوجوان طلباء کے مسائل" کا اہم موضوع زیر بحث لائیں گے اور ان مسائل کا حل پیش کریں گے جو ہماری ابھرتی ہوئی نئی نسل کو درپیش ہیں۔ ان نشستوں کے علاوہ کنونشن کے وہ اجلاس خصوصی اہمیت کے حامل ہوں گے جن میں ہمارے داعیِ انقلاب اور رہبر کارواں محترم پرویز صاحب تین اہم موضوعات لے کر آپ کے سامنے آرہے ہیں۔ حالات کی موجودہ کشمکش میں ان خطابات کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہو گی۔ اسی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ہر اجلاس کھلا اجلاس قرار دے دیا گیا ہے اور کنونشن کے ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص ان میں شرکت کر سکے گا۔ حالات کا اہم تقاضا یہی ہے کہ منکرِ قرآن کی دعوتِ قرآنی بیش از بیش وسعت پذیر ہو اور زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ کر عالم آرائی کا سامان بن سکے۔

میزان پبلیکیشنز کی رپورٹ

برادرانِ محترم! صدر کنونشن کمیٹی کی حیثیت سے ان گزارشات کے بعد مجھے میزان پبلیکیشنز کی سالانہ کارکردگی سے متعلق ایک مختصر سی رپورٹ بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنی ہے۔ کاروباری ضابطہ کی بنا پر میزان پبلیکیشنز کا ادارہ طلوعِ اسلام یا آپ کی اس کنونشن سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود آپ کو اس حقیقت سے مجالِ انکار نہیں کہ آپ کے پیش نظر مقاصد کی نشر و اشاعت میں میزان کو آپ کے نقیب خصوصی کا درجہ حاصل ہے۔ پاکستان کا یہی وہ واحد اشاعتی ادارہ ہے جو طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر اور تعلیمات کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے منظرِ عام پر لا رہا ہے اور اپنی مالی مشکلات کے باوجود گزشتہ سوا دو برس کی مختصر سی مدت میں اس نے

دعوتِ قرآنی کے وہ شاہکار منظرِ اشاعت پر پیش کئے ہیں جن کی بدولت علم و بصیرت کی بارگاہیں جگمگا اٹھی ہیں۔

میزان پبلیکیشنز کے آنریری مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت میں یہ عرض کرنے میں فخر محسوس کروں گا کہ ہماری کوششیں گذشتہ دو برس سے مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت پر مرکوز ہیں۔ سابقہ کنونشن تک ہم اس کے چار پارے شائع کر چکے تھے اور اب یہ سلسلۂ اشاعت گیارہویں پارہ تک پہنچ گیا ہے۔ مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کے ساتھ ساتھ میزان پبلیکیشنز نے پرویز صاحب کی مشہور تصنیف "فردوسِ گم گشتہ" کا نیا ایڈیشن بھی ابھی ابھی شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اور جلد ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ یہ کتاب کئی سال سے نایاب تھی اور اس کی مانگ برابر جاری تھی۔ میزان نے اسے نئے حسن ترتیب سے شائع کیا ہے اور اس طرح شائقین کی دیرینہ مانگ حسن و خوبی سے پوری کر دی ہے۔ علاوہ بریں علامہ سلیم جیراجپوری مرحوم کی "تاریخ الامت" کی اولین جلدیں بھی کچھ عرصہ سے نایاب تھیں میزان پبلیکیشنز نے ان کے نئے ایڈیشن شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے اور اب وہ آٹھ جلدوں کا مکمل سیٹ ضرورتمند حلقوں تک پہنچانے کے قابل ہے۔ مفہوم القرآن کے پہلے پارے، غلام اور لونڈیاں، اور اسبابِ زوالِ امت کے سستے ایڈیشن بھی شائع کئے گئے ہیں۔

میں تمام بزموں اور ان کے نمایندوں سے گزارش کروں گا کہ میزان پبلیکیشنز کی اس کارکردگی کو سامنے رکھئے اور ان مطبوعات کی اشاعت کو عام کرنے میں پوری سرگرمی سے ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ میزان نے جو کچھ کیا ہے وہ آپ ہی کے مقاصدِ عالیہ کی نشر و اشاعت کی خاطر کیا ہے اور اس سلسلہ میں آپ کا فریضۂ اشاعت میزان سے کم نہیں۔ میں ان بزموں کا ممنون و مشکور ہوں جو قرآنی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ اور ان بزموں کا تو خاص طور پر شکر گزار ہونا چاہیئے جو لٹریچر تو منگواتی ہیں لیکن اس کی قیمت کی ادائیگی وعدۂ فردا پر ٹالتی چلی جاتی ہیں۔ ان کا شکریہ اس لئے کہ ان کی اس روش کے باعث میزان کا کاروبار ختم ہو جائے گا اور مجھے اس گائے کے سینگ پکڑے رہنے سے فراغت مل جائے گی۔

محترم احباب! مجھے لغات القرآن فنڈ کے سلسلے میں بھی ضروری وضاحت آپ کی خدمت میں پیش کرنی ہے اس فنڈ کی رقم بیالیس ہزار تین صد روپے کے قریب تھی۔ ادارہ کی طرف سے اس رقم کی قیمت کے برابر کتب میزان کو مہیا کی گئی تھیں۔ اس اعتبار سے یہ فنڈ میزان پبلیکیشنز کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس وقت یہ کتابیں فروخت ہوں گی یہ رقم ادارہ کو ادا کر دی جائے گی تاکہ وہ کنونشن کے فیصلے کے مطابق اسے کنونشن کے سامنے پیش کر دے۔

رفقائے محترم! اپنی گذارشات ختم کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر آپ احباب کی کنونشن میں شرکت فرمانے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کنونشن میں آپ کو ربط باہمی کے بہترین مواقع حاصل ہوں گے۔ ایک دوسرے سے اخوت و محبت کا سلسلہ بڑھے گا۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اہم تجاویز پر غور ہو گا۔ بہت سے اہم فیصلے

ہوں گے۔ بہت سی الجھنوں کا حل سامنے آئے گا۔ فکر آنی فکر کے بہت سے گوشے روشنی میں آئیں گے۔ میری گزارش ہے کہ ان امور سے پوری دلچسپی اور وابستگی کا ثبوت دیجئے اور جو کچھ یہاں سے اخذ کیجئے اسے ان احباب تک پہنچائیے جو اپنی معذوریوں کے باعث کنونشن میں شرکت نہیں کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ کس قسم کی مشکلات اور مخالفتیں آپ کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنے ارفع و اعلیٰ مقاصد پر یقین قائم رکھا اور پورے عزم کے ساتھ حسن کارانہ انداز میں اپنی جد و جہد جاری رکھی تو مشکلات و موانعات کا یہ حصار ٹوٹ کر رہے گا اور منزلیں آپ کے قدم لینے آگے بڑھیں گی۔ میری دعا ہے کہ خدا ہمیں بیش از بیش اپنے دین کی خدمت کے مواقع عطا فرمائے اور اور اس کنونشن کو اپنے مقاصد جلیلہ میں کامیابی سے بہرہ ور کرے۔ والسلام۔

علامہ احمد امین مصری مرحوم کی

علمی اور تاریخی کاوشوں کا شاہکار

فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد عثمانی نے اردو زبان میں منتقل کیا

اس دور کی علمی حرکات اور تہذیبی کیفیات کا تفصیلی جائزہ جب آفتاب اسلام کی جلوہ باریوں نے بزم انسانی کو منور کیا

ضخامت - ۹۰۰ صفحات ——— قیمت - آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷ ربی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رپورٹ

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

رفقائے محترم! سلام و رحمت

جادۂ شوق کے مختلف مراحل میں جو راہرو دیانت داری سے اپنے سفر کا جائزہ نہیں لیتا وہ کبھی حتم و یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ہر قدم واقعی جانب منزل اٹھ رہا ہے یا اسے منزل سے دور لئے جا رہا ہے۔ ہمارے یہ سالانہ اجتماعات بھی درحقیقت ایک یوم الحساب کی سی اہمیت رکھتے ہیں یہاں تھوڑی دیر رک کر ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ آج اسی یوم الحساب کا منظر ہمارے سامنے ہے۔ اور اس نقطۂ نظر کے تحت جب نگاہیں طے کردہ منزل کی طرف اٹھتی ہیں تو اس راہ میں بیشتر ایسے اقدامات نظر آتے ہیں جو موجب خیر و برکت اور خوشگوار امیدوں کے آئینہ دار ہیں کچھ تلخ حقائق بھی ہیں جن کا تذکرہ اس مقام پر مناسب نہیں۔ انہیں کل صبح کے خصوصی اجلاس میں الگ پیش کر دیا جائے گا۔ اس لئے اس موقع پر میں اس داستان کے ان خوشگوار گوشوں کو ہی آپ کے سامنے لا رہا ہوں جو ہماری فعال بزموں کے حسنِ عمل کے شاہکار رہیں۔

حسنِ عمل کے شاہکار

چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے لندن کی بزم ہمارے سامنے آتی ہے۔ محترم گلزار محمد چغتائی - مقبول محمود فرحت، اور دیگر احباب کی قیادت میں' اس بزم نے (TAPES) کی وساطت سے جس عزم و ہمت کے ساتھ قرآن کی زندگی بخش آواز انگلستان کے بڑے بڑے شہروں تک پہنچانے کی سعی کی ہے اس کی رپورٹ خود مفکر قرآن کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو لاتی رہی۔ ان احباب کے ماہانہ اجتماعات خصوصی اہتمام سے منعقد ہو رہے ہیں اور ان میں پاکستانی طلبار کے علاوہ بڑے صاحب فکر و بصیرت حضرات کو شرکت کے مواقع حاصل ہیں۔ مزید برآں ان احباب نے لندن کی شہرۂ آفاق وسعتوں پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ وہ (TAPES) میں محفوظ نشید قرآنی کو لے کر انگلستان کے دیگر ممتاز مرکزوں کی سمت نکل کھڑے ہوتے اور اس طرح فضلائے مغرب میں جہاں جہاں یہ آواز گونجی، قرآنی فکر و بصیرت کی قندیلیں روشن کر گئی۔ اپنی ان گرانقدر

مساعی کی بنا پر لندن کے احباب بجا طور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں اور اس کے لئے ادارہ انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

بزم کراچی

بزم کراچی کے سرگرم عمل اور ان تھک احباب کی مساعی جمیلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ سچ پوچھئے تو اس بزم کے احباب ہمارے حزب قرآنی کا مقدمۃ الجیش ثابت ہو رہے ہیں۔ سندھ مدرسہ اسمبلی ہال کی ہفتہ وار رونقیں بہانگ دہل ان کے حسن عمل کی شہادت دے رہی ہیں۔ اور کراچی کے عظیم شہر میں قرآنی فکر کے چرچے جس حسن و خوبی سے چاروں طرف پھیلتے جا رہے ہیں وہ ان کی حسن کارانہ تگ و تاز کی آئینہ دار ہے۔ محترم شیخ محمد شفیع صاحب کی نمایندگی میں ان احباب نے شانہ بشانہ آگے بڑھتے ہوئے جو شمش کردار کی تابندہ و درخشندہ مثال قائم کی ہے جو ہر بزم کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتی ہے۔ اسی کامیاب جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ نومبر میں پرویز صاحب کے سالانہ دورۂ کراچی کے موقع پر قرآن کی دعوت انقلاب وہاں اس شان سے گونجتی رہی کہ علمی حلقوں میں نور و نکہت کا ایک انوکھا سماں بندھ گیا۔ علاوہ بریں بزم کراچی کا ایک اور کارنامہ ایسا ہے جو، عجب نہیں، اسے جریدۂ عالم پر ثبت دوام عطا کر دے۔ آپ احباب کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن ٹیپ (TAPE) میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر یہ (TAPES) مختلف مقامات پر سنائے جاتے ہیں۔ ہر ہفتے درس کو ریکارڈ کرنے کے لئے ایک نئے ٹیپ (TAPE) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے (TAPES) کے جس قدر ذخیرے مطلوب ہیں۔ وہ ظاہر ہے۔ سورۂ بقرہ کے اختتام پر جب یہ ذخیرہ ختم ہو گیا تو مزید درسوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ پہلے (TAPES) کو صاف کر کے اس کی جگہ نئے درس ریکارڈ کرائے جائیں۔ چنانچہ اس طرح جب ہم سورۂ آل عمران کے اختتام تک پہنچے تو سورۂ بقرہ کے تمام درس مٹ چکے تھے۔ اور ان (TAPES) پر سورۂ آل عمران کے درس ریکارڈ ہو گئے تھے۔ یہ درس ہمارے لئے جس قدر گراں بہا متاع ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے ذریعے یہ قرآنی حقائق ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ سائنٹیفک ایجاد کا یہ بہت بڑا احسان ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس متاع بے بہا سے محروم ہو گئے۔ اس نقصان کا احساس ہر قلب حساس کو وقف اضطراب کر رہا تھا اور اس کے عملی حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ للہ الحمد کہ اس کے لئے بھی کراچی کی بزم آگے بڑھی اور اس نے سینکڑوں روپوں کے خرچ سے کچھ نئے ٹیپ مہیا کر لئے ہیں جو (MASTER TAPES) کا کام دیں گے۔ یعنی ان پر ریکارڈ شدہ درس ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ بلاشبہ بزم کراچی کی یہ گرانمایہ پیش کش ہماری تاریخ میں نمایاں رہے گی اور اسے ہمیشہ قدر و احترام کے احساس سے یاد کیا جائے گا۔ میں ادارہ کی طرف سے اور آپ احباب کی اجازت سے، آپ کی طرف سے بزم کراچی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی مشکور فرمائے

اور انہیں دعوتِ قرآنی کی خدمت کی بیش از پیش توفیق دے۔

اس کے علاوہ بزم کراچی کے نمایندہ محترم شیخ محمد شفیع صاحب کی ایک اور سعیٔ جمیلہ بھی ہم سب کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہے۔ پچھلے سال احباب نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہر دو صوبائی اسمبلیوں اور نیشنل اسمبلی کے ارکان کو طلوعِ اسلام ہر ماہ باقاعدہ اور بلاقیمت بھیجا جائے۔ تجویز معقول تھی لیکن طلوعِ اسلام کے لئے اس بار کو اٹھانا بعید از شکل تھا جو پانچصد پرچے ماہانہ کی شکل میں اس پر پڑتا تھا۔ اس کے لئے محترم شفیع صاحب نے یہ ذمہ لیا کہ وہ ایک سال کے اخراجات کی ادائیگی کا انتظام کر دیں گے۔ (یہ سال جولائی میں ختم ہو جائے گا)۔ اللہ تعالیٰ شیخ صاحب موصوف کی اس کوشش کو بار آور فرمائے۔

بزمِ لاہور

یہ مقامِ امتنان و تشکر ہے کہ لاہور کی بزم نے سال گزشتہ میں زندگی، حرکت اور عمل کا قابلِ فخر ثبوت دیا ہے۔ لاہور میں اجتماع کی شکل صرف پرویز صاحب کا درسِ قرآن رہی ہے۔ لیکن ضرورت کا تقاضا تھا کہ اندرونِ شہر میں بھی اجتماعات کی صورت پیدا کی جائے۔ لاہور کی بزم نے ان اجتماعات کا انتظام کیا چنانچہ گزشتہ دسمبر سے اس سلسلے میں اب تک وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں تین شاندار اجتماعات ہو چکے ہیں۔ یہ اجتماعات حاضری اور ذوق و شوق کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے اور شہر میں ان کا اثر بعید خوشگوار رہا۔ لیکن اس بزم کا سب سے بڑا کارنامہ تو ہمارا یہ اجتماع ہے۔ اس کے لئے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا پنڈال سے باہر نکل کر دور دور تک نظر دوڑائیے۔ چاروں طرف فضا میں بزمِ طلوعِ اسلام کا پرچم لہراتا دکھائی دے گا۔ اس کے لئے نمایندہ بزم محترم میاں عبدالخالق اور ان کے رفقاء، ادارہ اور آپ احباب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزائم اور ہمتوں کو برکت عطا فرمائے۔

سلسلۂ نشر و اشاعت

جیسا کہ آپ احباب کو بخوبی علم ہے، پرویز صاحب کی لغات القرآن اور مفہوم القرآن کا سلسلہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلوں میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ لغات القرآن کی طباعت و اشاعت سے ہم دو سال قبل شایانِ شان طور پر عہدہ برآ ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد مفہوم القرآن کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اب گیارہویں پارے تک پہنچ گیا ہے۔ یہ اہم کام میزان پبلیکیشنز کے اپنے پریس میں سرانجام پا رہا ہے اور ہم ان الجھنوں اور پریشانیوں سے آزاد ہو چکے ہیں جو قرآنی لٹریچر کو دوسرے چھاپہ خانوں سے چھپوانے میں لاحق رہتی تھیں۔

لغات القرآن کی طباعت کے سلسلے میں ایک اہم بات کا دہرا دینا ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، اس اہم مقصد کی سرانجام دہی کے لئے کنونشن نے ایک فنڈ جمع کیا تھا۔ جس کی کل میزان سوا بیالیس ہزار روپے کے قریب تھی (یہ تمام رقم میزان پبلیکیشنز کے منیجنگ ڈائرکٹر کی رپورٹ میں درج ہے)۔ اس رقم کے

متعلق کنونشن نے طے کیا تھا کہ اتنی قیمت کی کتابیں میزان پبلیکیشنز کی تحویل میں دیدی جائیں۔ اور جب ان کی فروخت سے روپیہ وصول ہو جائے تو اسے کنونشن کی طرف واپس منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ ادارہ نے یہ کتابیں میزان پبلیکیشنز کے حوالے کر دی تھیں اور وہ ان کی حفاظت اور فروخت کے ذمہ دار ہیں۔ البتہ ان کی فروخت کے بعد روپے کی واپسی ادارہ کی وساطت سے ہوگی۔

مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ میزان نے پرویز صاحب کے اہم شاہکار — فردوس گم گشتہ — کا نیا ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔ یہ کتاب مشتمل تھی پرویز صاحب کے ان اہم مضامین و مقالات پر جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوئے اور ان تقاریر پر جو وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہیں۔ یہ کتاب ایک مدت سے نایاب تھی اور اب پرویز صاحب کی نظر ثانی کے بعد اسے نئے حسنِ ترتیب سے میزان نے شائع کیا ہے۔ اس اشاعت سے اس کے شائقین کی دیرینہ مانگ پوری ہو گئی ہے۔ "تاریخ الامت" کی اولیں جلدوں کی از سرِ نو اشاعت اس پر مستزاد ہے۔

میزان کی ان مطبوعات کے علاوہ خود ادارہ طلوعِ اسلام نے بھی دوران سال میں حسبِ ضرورت کچھ پمفلٹس شائع کئے اور ہزموں کی وساطت سے انہیں ملک کے ہر گوشے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ان پمفلٹوں میں "الزامات پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ" "فتنۂ انکارِ حدیث کیسے مٹ سکتا ہے؟" اور "قائدِ اعظم کا پاکستان" جیسے پمفلٹ شامل ہیں ان کی اشاعت سے جہاں ہمارے مسلک و مقصد کے بہت سے گوشے نکھر کر عوام کے سامنے آگئے وہاں مخالفین کے جھوٹے اور نارواپروپیگنڈے کے پردے بھی بڑی حد تک چاک ہو گئے۔ اس قسم کے پمفلٹوں کا سلسلہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سب سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوا ہے۔ ادارہ اس مہم کو زیادہ سے زیادہ وسیع بنیادوں پر جاری رکھنے کا آرزومند ہے لیکن ہزموں کے، اجتماعی تعاون کے بغیر اسے زور و شور سے آگے بڑھانا ممکن نہیں۔

پرویز صاحب کے دورے

قرآنی انقلاب کی اس تحریک میں پرویز صاحب کو داعیٔ انقلاب اور میر کارواں کی حیثیت حاصل ہے اور اس دعوتِ فکر کو جس حسنِ انداز سے علیٰ وجہ البصیرت وہ پیش کر سکتے ہیں، کسی دوسرے سے ممکن نہیں۔ اس بنا پر اکثر ہزموں کی طرف سے یہ دعوتیں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہ ان کے ہاں تشریف لائیں اور پبلک اجتماعات سے خطاب فرمائیں۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ عمر کے تقاضوں اور شدید ذہنی کاوشوں کے باعث اس سال پرویز صاحب کی صحت پر کافی ناگوار اثر پڑا۔ اپنے مشن کی اہمیت کے پیشِ نظر اس حالت میں بھی وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے چلے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحت تیزی سے گرتی گئی — یہ سب کچھ ہوتا رہا اور اس کے باوجود انہوں نے راولپنڈی سب کنونشن میں شرکت کی۔ وہاں پریس کانفرنس اور پبلک اجتماعات سے خطاب کیا۔ وہاں سے وہ وارسک اور پشاور گئے اور وہاں بھی پریس کانفرنس اور پبلک اجتماعات میں تقریریں ارشاد فرمائیں۔

اس دورے کی تکان ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ خرابیٔ صحت کے باوجود انہوں نے کراچی کے سالانہ دورے کے لیے کمرِ ہمت باندھ لی - ۱۲ نومبر سے ۲۴ نومبر تک، اپنی معذوریوں سے دامن کش ہو کر انہوں نے کراچی میں جو معرکے سر انجام دیئے، ان پر حیرت ہوتی ہے - کمرشل ہال، گل رعنا کلب، سندھ اسمبلی ہال، یونیورسٹی کیمپس، میٹروپول کے یادگار اجتماعات میں، ان کی دعوت انقلاب ہزاروں شیدائیوں کے لئے فردوس گوش بنتی رہی - انہوں نے محترم خالد اسحق، اسد حمید، اور طاہرہ بیچ (رام عالف)، کی دعوتوں پر پرائیویٹ مجالس میں بھی ملک کے اہم ترین مسائل کو قرآن کی رو میں پیش کیا اور فکری جمود کی راکھ میں چنگاریاں سی بھڑکا دیں - ان مجالس میں کراچی کے ممتاز اہل علم اور قانون دان شریک ہوئے اور ہر حلقے نے مفکر قرآن کی دعوت قرآنی کا گہرا اثر ہی قبول نہیں کیا بلکہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ قرآن ان پریشان کن اور تلخ مسائل کا کس قدر نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے جن کی الجھنوں میں ہمارے معاشرے کی توانائیاں زائل ہوتی چلی جا رہی ہیں -

دو ہفتوں کی جان توڑ مہم سے فارغ ہو کر جب پرویز صاحب کراچی سے واپس لاہور پہنچے تو ان کی صحت، جو پہلے ہی خراب چلی آ رہی تھی، اضطراب انگیز کیفیت سے دوچار تھی - ان کا دل بے حد مطمئن اور مسرور تھا - ان کے چہرے پر بھی جانی پہچانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن ان کا جسم بے حد مضمحل اور نڈھال ہو چکا تھا - اور کئی ماہ تک مسلسل یہ صورت رہی کہ بار بار انہیں اپنے محبوب قلم اور میز سے جدا ہو کر صاحبِ فراش ہونا پڑا - پرویز صاحب کی گرانمایہ شخصیت عالمِ اسلام کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے لئے شمعِ منزل کا کام دے رہی ہے - اس شمعِ رخشندہ کو ادارہ جب کبھی علالتِ طبع کے جھونکوں کی زد میں جھلملاتے دیکھتا ہے تو کتنے ہی اندیشے دل میں لرزشیں بن کر ابھر آتے ہیں - اس دوران میں ایک شدید جھٹکا تو ایسا آیا کہ احباب کے دل بیٹھ گئے - لیکن ربِ رحیم کی رحمتوں کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ بھی بخیریت گزر گیا - اب ان کی صحت ایک حد تک بحال دکھائی دے رہی ہے اور اس کنونشن کی آمد آمد نے انہیں پہلی سی توانائیاں واپس لوٹا دی ہیں -

درسِ قرآن کا سلسلہ

ہر اتوار کی صبح کو پرویز صاحب کی قیام گاہ پر ان کے درسِ قرآن کا سلسلہ پورے اہتمام اور باقاعدگی سے جاری ہے - ایک آدھ ناغہ کے سوا انہوں نے اپنی خرابیٔ صحت کو اس مجلس کی باقاعدگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا - یہ درس بذریعہ ٹیپ ریکارڈ ہوتے ہیں اور بعد ازاں دیگر قرآنی مراکز کو بھیج دیئے جاتے ہیں - لندن، کراچی، راولپنڈی، ڈیرہ، پشاور، مردان، جہلم اور سیالکوٹ کی بزموں کے زیرِ اہتمام انہیں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں شائقین کے اجتماعات میں سنایا جاتا ہے اور پھر وہاں سے حسبِ ضرورت دیگر ملحقہ شہروں میں پہنچانے اور سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے - اس طرح ہزاروں انسانوں کو قرآن کی تعلیمات سے کسبِ فیض کے مواقع حاصل ہو رہے ہیں -

ادارہ میں آمدہ اطلاعات مظہر ہیں کہ بہت سے دیگر احباب اور بزم میں بھی اپنے ہاں ٹیپ ریکارڈوں کی خرید کیلئے کوشاں ہیں۔ ان مبارک و مسعود کوششوں سے درس قرآن کا یہ انقلاب آفریں سلسلہ اپنی روشنی کو بیش از بیش وسعتوں تک پھیلائے گا اور قرآن کے حیات بخش پیغام کی عالم آرائیاں وسعت پذیر ہوتی جائیں گی۔

طلوعِ اسلام آخر میں، میں آپ کی توجہ طلوع اسلام کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ طلوع اسلام ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ہماری تحریک کا نقیب اور قرآنی فکر کا پیامبر ہے۔ اس اعتبار سے یہ جس قدر مستحکم بنیادوں پر استوار ہوگا اور جتنی زیادہ اس کی اشاعت ہوگی اسی قدر ہماری تحریک آگے بڑھے گی۔ اس کی مالی پوزیشن یہ ہے کہ یہ مسلسل خسارے میں جا رہا ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے جرائد و رسائل جو مخصوص جماعتوں کے ترجمان ہوتے ہیں، خسارے میں ہی چلتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ طلوع اسلام کے معاملہ میں یہ پوزیشن کسی اعتبار سے بھی اطمینان بخش نہیں کہلا سکتی ـــــ یہ آپ کا اپنا پرچہ ہے ـــــ ادارہ تو اس کا امین ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس سے متعلق یہ صورت آپ کے گوش گزار کر دوں۔ تاکہ آپ اس سے بے خبر نہ رہنے پائیں۔

ویسے آپ یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ طلوع اسلام کی آواز اب دُور دُور تک پہنچ رہی ہے اور زیادہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

مسلمانوں کی موجودہ حالت کیوں ایسی ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟
تشخیص اور علاج دونوں بے نظیر۔

تازہ ایڈیشن نظرِ ثانی کے بعد
سستا ایڈیشن۔ قیمت ایک روپیہ۔ اعلیٰ ایڈیشن قیمت مجلد دو روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

طلوعِ اسلام اور اسکی دعوتِ انقلاب

۱۴ اپریل کی صبح کو طلوع اسلام کنونشن میں محترم شیخ محمد شفیع صاحب کا صدارتی خطاب

حضراتِ محترم!

قبل اس کے کہ محترم پرویز صاحب سے یہ درخواست کروں کہ وہ اپنے خیالات سے ہمیں مستفید فرمائیں میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کو مختصر الفاظ میں تحریک طلوع اسلام سے متعارف کرادوں اور اس کے ساتھ ہی اُن اصحاب کو جو اس تحریک سے وابستہ ہیں ان کے ایک اہم فریضہ کی یاد دہانی کرادوں۔

برادرانِ عزیز!

قرآنی انقلاب کے روشن امکانات

بزمِ طلوع اسلام کی اس سالانہ کنونشن میں اتنے مانوس اور بہت سے نئے چہروں کو دیکھ کر میرا یہ ایمان پختہ تر ہو گیا ہے کہ ملک کی فضا ہر سال قرآن حکیم کی تعلیمات کے لئے زیادہ سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات بظاہر زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتی۔ مسلمانوں کے ایک ملک کے لئے یہ کہنا عجیب سا ہے کہ اس کی فضا قرآنی تعلیمات کے لئے سازگار ہے۔ لیکن برادرانِ عزیز! ادنیٰ سے غور و فکر سے اس بات کی اہمیت آپ پر روشن ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کیسی وسیع بات ایک مصرعے میں کہہ دی ہے

چیست قرآں خواجہ را پیغام مرگ

قرآن کریم تمام خود ساختہ خداؤں کے لئے پیغام مرگ ہے۔ قرآنی تعلیمات کا عملی نتیجہ یقیناً یوں مرتب ہوگا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج نہ رہے گا اور اس بات کے تصور سے ہی سرمایہ داری، جاگیرداری اور ملوکیت کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں جاگیرداری اور ملوکیت کا ذکر کچھ بے محل سا ہے۔ لیکن ہماری بدنصیبی کی شکایت کس سے کیجئے کہ آج بھی ملوکیت اور جاگیرداری کے عفریت مسلمان ملکوں میں زندہ ہیں۔

لیکن ہمیں اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے - یہ غیر اسلامی عناصر اور ادارے تو ہماری قوتِ عمل کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر خدا کی کائناتی قوتیں ہمیں بتدریج زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسلام سے قریب تر کر رہی ہیں پاکستان میں جاگیرداری کے خاتمے اور عائلی قوانین کے نفاذ کو قرآنی منزل کی طرف قوم کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے - قرآن کی حقیقی اور انقلاب آفریں تعلیمات کے راستے میں جاگیردار اور نام نہاد مذہبی پیشوا ہمیشہ حائل رہے ہیں - جاگیردار اس لئے کہ قرآن کا حتمی فیصلہ ہے "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" اور مذہبی پیشوا اس لئے کہ قرآن نے دوسروں کی کمائی پر زندہ رہنے والے مذہبی رہنماؤں کی دلنشگاف الفاظ میں شدید مذمت کی ہے - اسلام میں کسی مذہبی پیشوائیت کی گنجائش نہیں امر بالمعروف، نھی عن المنکر اور تبلیغ دین کے فرائض حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ارشادِ خداوندی کے مطابق پوری اُمتِ محمدیؐ کے سپرد کئے گئے ہیں -

تاریخ کی شہادت

حضراتِ محترم! دورِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے بعد انہیں طاغوتی قوتوں نے قرآن کے آبِ حیات کو غیر اسلامی تصورات کے زہر سے مسموم بنایا - لیکن اسلام تقدیرِ کائنات ہے، خدا کا آخری پیغام ہے، اور اسی لئے جاوداں ہے - قرآن حکیم دینِ حق کی اساس محکم ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ اسے نازل کرنے والے نے خود لیا ہے اور اسی اساس نے دین کے خلاف ہر سازش کو ناکام بنا دیا - وہ سازش جسے ملوکیت نے جاگیرداری، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی مدد سے جنم دیا تھا - یہی وہ قوتیں ہیں جو ہمیشہ چراغِ ہدایت کو بجھانے کے لئے سرگرمِ عمل رہی ہیں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

شرارِ بولہبی نام ہے ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا - حضرت موسیٰؑ کی جلیل القدر زندگی اور تعلیمات سے یہی نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے - فرعون ملوکیت کا اشارہ ہے - ہامان پاپائیت کا - اور قارون سرمایہ داری کا -

دعوتِ حق کے درخشندہ چراغ

لیکن قانونِ خداوندی کے تحت چراغِ مصطفویؐ ہمیشہ شرارِ بولہبی پر غالب آیا ہے - ملوکیت کے تاریک ترین ادوار میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کے فکر و عمل نے ہمیشہ ملوکیت کو لرزہ براندام رکھا - کاش میرے پاس اتنا وقت ہوتا کہ میں تاریخِ اسلام کے اس روح پرور اور ایمان افروز باب کو آپ کے سامنے تفصیل کے ساتھ پیش کر سکتا - تاریخ اسلام کی ان تفصیلات سے قطعِ نظر میں صرف یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ برصغیر اس باب میں خاص طور پر خوش نصیب رہا ہے - اس خاک سے وہ لوگ اٹھے ہیں جنہوں نے عجمی سازشوں کے پردے چاک کر دیئے - جن کا نغمہ بھی حجازی تھا اور لَے بھی حجازی تھی - خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ - حضرت شاہ

اسماعیل شہیدؒ۔ حضرت سید احمد شہیدؒ۔ سرسید احمد خاں اور علامہ اقبالؒ اور ایسے ہی دوسرے مفکرین پر جنہوں نے خدمت اور ایثار میں اس حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے، ایک مستقل ضابطۂ حیات ہے اور قرآن اساس دین ہے۔ ان بزرگوں کے بعض افکار سے مجھے اور آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ یہ لوگ معصوم نہ تھے ان پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی۔ اور ان کے افکار ان کے زمانے کے تقاضوں سے کہیں کہیں دب گئے ہیں۔ لیکن یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمتوں میں لکھی تھی کہ وہ ہمارے اندازِ فکر کا سلسلہ قرآن حکیم سے ملا دیں۔ مجدد الف ثانیؒ ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

شاہ ولی اللہؒ، جنہوں نے سماجی، سیاسی اور عمرانی فکر کے دروازے کھولے۔ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ جنہوں نے توحید کو مردہ عقیدے کی جگہ زندہ عقیدہ اور اپنا عمل بنا دیا۔ سرسید احمد خاں جس نے اس راز کو پا لیا کہ اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور اقبالؒ جس نے ہمیں بتایا کہ غلامی اور اسلام کبھی یک جا نہیں ہو سکتے۔ اسلام تقدیرِ کائنات ہے اور کائنات کی تقدیر کو بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی بنیادوں پر ایسا خطۂ زمین حاصل کریں جہاں خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم کی جائے۔ یہ ہے ہم پر ان بزرگوں کا احسان۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہم نے اس احسان کا اعتراف کس طرح کیا ہے۔ یہ داستان بڑی دل خراش ہے۔ ان میں سے کون ہے جسے کفر کے فتووں سے نوازا نہیں گیا۔ ایک طرف یہ لوگ آنے والی نسلوں کی زندگی کے لئے اسباب مہیا کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو کافر بنانے کے کارخانوں میں ان کے لئے فتوے تیار کئے جا رہے تھے۔ لیکن یہ بیچارے کافر گر بھلا ان لوگوں کو کیسے کچل سکتے ہیں جو منشائے خداوندی اور رضائے الٰہی کی خاطر آگ کو پھول اور دار و رسن کو انعام جانتے ہیں۔ جن کا یقین یہ ہو

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

علامہ اقبالؒ اور طلوعِ اسلام

حضراتِ محترم! بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ میں اقبالؒ کا ذکر کر رہا تھا جس نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں برصغیر میں اسلامی مملکت یا یوں کہئے کہ پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ مسلمان سیاست دانوں نے اس تصور کو کچھ عرصہ تک شاعر کا خواب سمجھا اور کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ انہیں حالات میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی ـــــ طلوعِ اسلام ـــــ یہ جریدہ جس کو ایک عظیم تحریک بننا تھا۔ جس کا نام حکیم الامت اقبالؒ نے خود تجویز کیا تھا اور جس کو روشن کرنے والے ہاتھوں میں علامہ اسلم جیراجپوری کا ہاتھ بھی شامل تھا۔ اسی اثنا میں علامہ اقبالؒ ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے۔

یہ ایک بڑا امتحان تھا۔ ذہنی اندھیرا جیسے بڑھتا جا رہا تھا مگر اس وقت بھی اقبالؒ ہی نے راہ دکھائی۔ اس نے طلوعِ اسلام کو یہی پیغام دیا تھا کہ افراد آتے ہیں اور افراد چلے جاتے ہیں، پیمانِ وفا اس سے باندھو جو ابدی ہے۔ جو قائم رہنے والا ہے، یعنی خدا سے اور اس کی کتابِ عظیم سے۔ یوں طلوعِ اسلام کا سفر شروع ہوا اور یہیں سے مخالفانہ کوششیں بھی شروع ہو گئیں۔ طلوعِ اسلام پر اہلِ قرآن کا لیبل لگایا گیا۔ وسیع تر معنوں میں تو اُمتِ مسلمہ ایک ہی جماعت ہے یعنی اہلِ قرآن۔ لیکن اس بدنصیبی کا کیا علاج کہ اس کتابِ مقدس کے نام پر مسلمانوں کا ایک فرقہ وجود میں آ گیا۔ یہ کتابِ مقدس جو فرقہ سازی کو شرک قرار دیتی ہے۔

سفر کا آغاز بہرحال طلوعِ اسلام نے اپنا سفر شروع کیا۔ مسلمانوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا قرآنی سبق عہدِ حاضر کی زبان میں دیا گیا۔ ملت کو جو خطرے درپیش تھے ان کی صرف نشاندہی نہیں کی گئی بلکہ طلوعِ اسلام ان کے خلاف نبرد آزما ہوا۔

طلوعِ اسلام کے دلائل نے دار دھا اسکیم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ملتِ اسلامیہ کے خلاف برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ داری کی سازشوں کو طلوعِ اسلام نے وضاحت کے ساتھ بے نقاب کیا اور مسلمانوں میں یہ یقین پیدا کیا کہ وہ ایک جداگانہ قوم ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کی خط و کتابت اقبال کی زندگی کے آخری دنوں میں مسئلہ پر ہوئی تھی، لیکن اقبال کی وفات کی وجہ سے یہ مسئلہ پایانِ کار تک نہ پہنچا تھا۔ طلوعِ اسلام نے اپنے صفحات کے ذریعے اس مشن کی تکمیل کی۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس سرسید کو اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے پہلے پہل ہوا اور پھر اللہ کا شیر محمد علی جوہر اس تلخی کا شکار ہوا۔ اقبال نے تلخ تجربات کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کریم کی روشنی میں اس مسئلہ کو پیش کیا اور طلوعِ اسلام نے ان کی تکمیل کی۔

تحریکِ پاکستان یہ تھا وہ ماحول جس میں ۱۹۴۰ء میں قائدِ اعظم کی عظیم رہنمائی میں اسلامیانِ برصغیر نے پاکستان کو اپنا قومی نصب العین قرار دیا۔ راوی کے کنارے، اقبال کے دیس میں قوم نے یہ فیصلہ کیا۔ اس نصب العین کی مخالفت تین حلقوں کی طرف سے ہوئی اور بڑی شد و مد کے ساتھ ہوئی۔ برطانوی شہنشاہیت، ہندو کانگریس اور وطن پرست علماء۔ پہلے دو محاذوں پر لڑنے کے لئے قائدِ اعظم کو رب العزت نے بے مثل صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن تیسرا محاذ سیاسی محاذ سے مختلف تھا۔ اور اس محاذ پر طلوعِ اسلام نے اپنی بساط بھر یہ لڑائی لڑی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے طلوعِ اسلام کی آواز، ملت کے نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے قلب کی گہرائیوں میں جگہ بناتی چلی گئی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور یوں یہ تحریک قوی تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ غلامی کی شبِ تار آزادی کی صبح میں بدل گئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتحِ مبین سے نوازا۔

خود ساختہ صالحین کا گروہ

ایک سخن گفتنی اور آپ کی خدمت میں پیش کرتا چلوں۔ وطن پرست مسلمانوں اور مولویوں کا موقف تو سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ یہ حضرات مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ لیکن ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو بھی تسلیم کرتا تھا اور تحریک پاکستان کو بھی غیر اسلامی یا کم از کم غلط قرار دیتا تھا۔

اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اب یہی گروہ "غیر صالح" عناصر سے سیاسی جوڑ توڑ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ ۱۹۶۲ء میں دس کروڑ مسلمانوں کی تمنا ایک سنگین حقیقت بن گئی۔ دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک پاکستان نقشہ پر ابھر آیا۔ قیام پاکستان کے ساتھ طلوع اسلام کا نیا دور شروع ہوا۔ وہ خطۂ ارض اسلامیان برصغیر کو خدا کی مدد سے حاصل ہو گیا۔ جسے اسلامی اصولوں کا گہوارہ بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ تاریخ عالم کا یہ سانحہ نیا نہیں ہے کہ مسافر منزل پر پہنچ کر سو جاتے ہیں اور کسی مقام کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

مقصود و منتہیٰ

یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔ بیشتر لوگ حصول پاکستان کو متاع عزیز اور مقصود بالذات سمجھ بیٹھے جبکہ پاکستان حصول مقصد کا ایک ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ اور وہ مقصد عزیز، ایک اسلامی ریاست کا قیام۔ ایسی ریاست جس میں انسان صرف خدا کا مطیع ہو، اپنے جیسے انسانوں کا اطاعت گزار نہ ہو، جہاں ہر شخص کو بحیثیت انسان کے عزت و تکریم حاصل ہو۔ جہاں ہر فرد کی خودی ارتقاء کے مراحل سے بآسانی گزرتی جائے، جہاں ہر شخص کو ضروریات زندگی بہم پہنچانا حکومت کا فرض ہو۔ اور یاد رکھئے کہ اسلامی نظام میں تحفظ ذات کے وسائل بھی ضروریات زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ جہاں عدل و انصاف ہر شخص کو اپنے حقوق کے طور پر بلا معاوضہ حاصل ہو جہاں سچ کہنا اچھی بات ہی نہ ہو بلکہ ہر شہری پر فرض ہو۔

برادران عزیز! اسلامی ریاست کے دل نواز خدوخال اس مختصر تعارف میں کیسے اور کیونکر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ یہ نظام آپ کے دل کی دھڑکن بن چکا ہے۔ ہاں تو ہوا یہ کہ ایک آواز تھی جو بار بار ان خصوصیات نظام اسلامی کو دہراتی تھی اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو وہ آواز ہم سے رخصت ہو گئی۔ لیکن نہیں وہ آواز آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ فرنگی تعلیم کدوں میں پلے ہوئے اس قانون دان کو اس نے اپنے حقائق کے اظہار کے لئے

حصول پاکستان اور طلوع اسلام

چن لیا۔ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا تھا کہ قیام پاکستان کے ساتھ طلوع اسلام کا نیا دور شروع ہوا۔ مناظرہ بحث و مباحثہ اور خرابات کا دور ختم ہوا۔ اب ہمیں اپنے مستقبل کی شیرازہ بندی کرنی تھی۔ اپنے لئے ایک آئین بنانا تھا جس کے تحت زندگی بسر کرنی تھی۔ طلوع اسلام نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ محترم پرویز صاحب نے بلا مبالغہ ہزاروں صفحات ان نئی

ذمہ داریوں کے سلسلے میں طلوع اسلام میں لکھے۔ دستورِ اسلامی کی اسلامی اور قرآنی بنیادوں کو پیش کیا، جزئیات کی وضاحت کی، سیاسی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ قانونی نقطوں کو قرآن کی روشنی میں پیش کیا۔ غرضیکہ انسانی زندگی اور معاشرت کا کونسا پہلو ایسا تھا جس کو قرآن حکیم کی روشنی میں نہ پیش کیا گیا ہو اور جناب پرویز کی ان مساعیِ جلیلہ سے یہ حقیقت ایک بار پھر سب کے سامنے آگئی کہ قرآن ہر شعبۂ حیات میں کاروانِ انسانیت کو راستہ دکھاتا ہے۔

حضراتِ محترم! قائدِ اعظمؒ کے بعد پر خلوص فکر اور گہرا تجزیہ ہمارے سیاستدانوں کے حصہ میں نہ آیا۔ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کی اساس و بنیاد کی نشان دہی واضح الفاظ میں کی۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ قرآن ہمارے دستور کی بنیاد ہے گا۔

برادرانِ عزیز! یہ ہمارا ایمان ہے کہ

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

ہمیں قرآن حکیم اُسی ذاتِ اقدسؐ کے ذریعہ ملا ہے۔ اسی ذاتِ اقدسؐ نے اپنے عمل اور اسوۂ حسنہ سے قیامت تک کے لئے یہ بات روشن کر دی کہ قرآن پر لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً عمل کرنا ممکن ہے۔ ہمارے نزدیک اسوۂ حسنۂ نبوی اور سنتِ نبوی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ رسول اللہؐ کی عطا کردہ سب سے بڑی سنت یہی ہے کہ معاشرے کی تعمیر قرآن کی بنیادوں پر کی جائے۔ انسان کو اللہ کے سوا ہر معبود کی پرستش سے نجات دلائی جائے۔ اور طلوعِ اسلام اسی سنتِ نبوی کا داعی ہے۔

ملتِ پاکستان کے نئے اور عظیم تقاضوں کے تحت طلوعِ اسلام کی ذہنی تحریک نے ایک باضابطہ بزم کی صورت اختیار کی۔ یہ بزم طلوعِ اسلام پہلے بھی محض رسالہ نہ تھا بلکہ ایک تحریک کا درجہ رکھتا تھا۔

دعوتِ قرآنی کا آغاز

آج سے چودہ سال پہلے بزمِ طلوعِ اسلام کی سرگرمیاں کراچی میں ایک گھنے درخت کے سایہ تلے شروع ہوئیں۔ ایک مقرر اور دو تین سننے والے۔ یہ تھا آغازِ کار۔ لیکن وہ لوگ جو اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے اٹھتے ہیں وہ کبھی حوصلہ نہیں ہارتے۔ کیونکہ ان کا فرض تو اچھے انداز میں صدائے حق دوسروں تک پہنچانے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اور نتائج ترتیب دینا اللہ کا کام ہوتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے اور نتائج اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور یہ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی نہایت اہم دفعہ ہے کہ کوئی اچھا عمل ضائع نہیں ہوتا۔ عمل صالح اور کلمۂ حق کی مثال قرآن حکیم نے مبارک درخت سے دی ہے۔ بیج پودے میں بدلتا ہے اور پودا ایسے قدآور درخت میں جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان

پرویز صاحب کی خدمات

بزمِ طلوعِ اسلام کی سرسبز و شاداب شاخیں فضائے کائنات میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہیں۔

عزیزانِ محترم! خدا کا شکر ہے کہ آپ کی کوششیں اپنے نتائج پیدا کر رہی ہیں۔ عام فضا قرآن کے لئے سازگار ہو گئی ہے اور فضا کو سازگار بنانے میں محترم پرویز صاحب کی بصیرت افروز تصانیف کا حصہ سب سے اہم ہے۔ پرویز صاحب کا کارنامہ یہ نہیں ہے کہ بہت سے لوگ ان کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ پرویز صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہم میں قرآن کریم پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ وہ ہمیں ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی دعوت ہی نہیں دیتے بلکہ وہ ہر بات کو قرآنی معیار کے مطابق سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں لغات القرآن کی ترتیب اتنی بڑی دینی خدمت ہے جس کی عظمت کا اندازہ وقت گزرنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ لغات القرآن نے قرآنی الفاظ اور اصطلاحات کی حقیقی روح سے ہمیں وہ قرب عطا کر دیا ہے کہ اب ہر پڑھا لکھا انسان کتاب اللہ سے براہ راست فیضیاب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مفہوم القرآن نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں اس وضاحت اور جامعیت کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ قرآن حکیم میں کیسا ربط اور کیسا تسلسل ہے اور خاکم بدہن یہ کوئی بے ربط کلام نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر ہمیں بتایا جاتا تھا۔

ہماری ذمہ داریاں

رفیقانِ محترم! جو باتیں بزمِ طلوعِ اسلام کے پس منظر اور اس کی خدمات سے متعلق کہنی تھیں وہ کہہ چکا اب چند باتیں ذرا ہم اپنے بارے میں کر لیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ساری کائنات قوانینِ خداوندی کے تابع ہے اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ عالمِ انسانیت میں بھی اسلام کس طرح شعوری اور غیر شعوری طور پر غالب آ رہا ہے۔ آج کی مہذب دنیا حیاتِ اجتماعی کے بارے میں تجرباتی طور پر جن چند نتائج تک پہنچی ہے یہ باتیں خالقِ کائنات نے اپنے رسول آخرالزماںؐ کے ذریعے آج سے چودہ سو سال پہلے عطا کر دی تھیں۔ غلامی اور ملوکیت کے بارے میں آج کا انسان اب بھی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا جس کی نشان دہی قرآن حکیم نے کی تھی۔ اس نکتہ پر ایک بار پھر سوچئے کہ قوانینِ خداوندی کس آہستہ روی کے ساتھ عالمِ انسانیت میں مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان خدا کا رفیق بن جائے تو ہزار سال کا مرحلہ چند برسوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقدس صحابہؓ کی جماعت کے کارنامے ہمیں یہی پیغام دے رہے ہیں۔ دوستو! اپنے عمل کی رفتار تیز تر کر دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم قرآن کی روشنی میں جگمگا رہے ہیں۔ اسی راستے پر بڑھتے چلئے۔

سیاروں تیرا کب پہلے یہ گردشِ نالشِ کھی ہیں موڑ پہ صدیوں کے دن ایک جینے کے

آپ کو اپنے آپ میں ایک مقدس جنون پیدا کرنا ہے وہ جنون جس نے عہد حاضر کی بعض تحریکوں کو عالمی تحریک بنا دیا ہے اور آپ کے سر پر تو خدا اور قرآن کا سایہ ہے۔ اسلام آپ سے آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام مانگ رہا ہے۔ یاد رکھئے اسی میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔ یہی امن و سلامتی کا راستہ ہے۔ یہی ہماری قوم کے لئے حیاتِ جاوید کا نسخہ ہے

آپ اس یقین کے ساتھ اپنی جد و جہد جاری رکھئے کہ بیتاریک اور غیر اسلامی تصورات کی رات بھاگ رہی ہے اور قرآنی تصورات کا سورج ابھر رہا ہے۔

خدا ہمیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو اپنے نظام کے دامن میں جگہ دے۔

اب میں محترم پرویز صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ "انسان کے بنیادی حقوق" کے موضوع پر ہم سے خطاب فرمائیں تاکہ آج پھر ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن ہمیں انسانی فکر سے کس قدر آگے لے جاتا ہے۔ قرآن کے بغیر تو ہم مقام آدمیت کو بھی سمجھ نہیں سکتے۔

محترم میاں عبدالخالق صاحب کا پیغام

بزموں اور احباب کے نام

۱۔ بحیثیت صدر کنونشن کمیٹی میں ان تمام حضرات کا بخلوص قلب شکر گزار ہوں جنہوں نے کنونشن کے انتظامات کے سلسلے میں مالی تعاون سے کام لیا اور اپنے عطیہ جات ارسال فرما کر ہمارا کام آسان کر دیا۔

۲۔ طلوع اسلام ہال و کالج فنڈ کمیٹی کی حیثیت سے میں ان تمام احباب کا بھی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے کنونشن کے آخری اجلاس میں ہال و کالج کی تعمیر کے لئے عطیوں کا اعلان کیا۔ ان میں سے جن احباب نے موعودہ رقوم ابھی تک نہیں بھیجیں وہ اولین فرصت میں یہ رقوم بھیج دیں۔ مزید برآں بزموں اور مذکورہ احباب کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد عظیم کے لئے مالی امداد و تعاون کا سلسلہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیں اور مخیر حضرات پر اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے انہیں اس میں حصہ دار بننے کی ترغیب دیں۔ تاکہ زمین خریدنے اور دیگر انتظامات کا آغاز شایانِ شان طور پر ہو سکے۔

(رقوم کی ترسیل میرے نام ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔ کے ایڈریس پر کی جائے۔)

۳- میزان پبلیکیشنز کی طرف سے بھی یہ اپیل کرنی ہے کہ جن بزموں نے ابھی تک بقایا رقوم کی ادائیگی نہیں کی وہ جلد از جلد اس سے عہدہ برآ ہوں اور "فردوس گم گشتہ" کے نئے ایڈیشن کی اشاعت و فروخت میں سرگرمی سے کام لیں۔ بزموں پر واضح رہنا چاہیئے کہ واجب الادا رقوم کی عدم ادائیگی کی وجہ سے میزان کے بہت سے کام رُکے پڑے ہیں۔

والسلام۔

نیاز آگیں (میاں) عبدالخالق

صدر طلوع اسلام کنونشن کمیٹی۔ صدر طلوع اسلام ہال و کالج فنڈ کمیٹی و

مینجنگ ڈائرکٹر میزان پبلیکیشنز، ۲۷- بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور)

صدیقی صاحب سے اظہارِ تعزیت!

ابھی ابھی ادارہ میں محترم لطیف الرحمٰن صدیقی کے فرزند ارجمند (خالد میاں) کے سانحۂ رحلت کی دردناک خبر موصول ہوئی ہے۔ صدیقی صاحب محترم پرویز صاحب کے حلقۂ قرآنی کے دیرینہ وابستگان اور کراچی کے ممتاز احباب میں سے ہیں۔ ان کے دونوں بڑے بیٹے (خالد و رؤف) انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور خالد میاں کو جلد ہی تعلیم سے فراغت پا کر واپس لوٹنا تھا۔ بوڑھا باپ امیدوں کے سہانے تصوّر دل میں لئے بڑی بے تابی سے اپنے اس نورِ نظر کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ۱۹- اپریل کی صبح کو دمے تنفس کا دورہ پڑا اور ایمبولنس کار کے پہنچنے سے قبل ہی اس نے غریب الوطنی میں آخری ہچکی لی اور چھوٹے بھائی کی آغوش میں دم توڑ دیا۔ دیارِ غیر میں جواں نصیب رؤف پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی اور جب کراچی میں اس دلخراش سانحہ کی خبر پہنچی تو بوڑھے باپ کا دل خون ہو کر رہ گیا۔ اس کی ساری حسرتیں اور ارمان حرماں نصیبی اور بے چارگی کے آنسو بن کر بہہ گئے۔ ایک غم نصیب باپ پر اس جگر پاش حادثے میں جو گزری وہ اس کا کلیجہ شق کرنے کے لئے کافی ہے۔ ادارہ طلوع اسلام اور محترم پرویز صاحب، صدیقی صاحب کی اس جانکاہ مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے ہیں اور ان سے دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے صدیقی صاحب اور دیگر وابستگانِ مرحوم کے لئے صبرِ جمیل کی دعا کرتے ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ خدائے رحیم ان گہرے زخموں کا اندمال فرمائے۔

نقد و نظر

جسٹس شاہ دین
(انگریزی)

لکھنے والے ہوں میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) اور وہ لکھیں اپنے والد ماجد جسٹس میاں محمد شاہ دین مرحوم کے متعلق۔ اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ وہ کیا چیز ہو جائے گی۔ ؎ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔۔۔ لیکن میاں بشیر صاحب کا تو کمال اس میں ہے کہ "چہرہ دل پر احتیاط کے ساتھ" انہوں نے ساری کتاب میں کہیں یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ بیٹا اپنے باپ کے متعلق کچھ کہہ رہا ہے۔ کتنا دشوار تھا یہ مرحلہ اور میاں صاحب اس میں سے کس حسن کارانہ انداز سے گزر گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کی تربیت میاں شاہ دین مرحوم کے ہاتھوں میں ہوئی ہو اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

لیکن یہ انگریزی زبان کی قریب ساڑھے چار سو صفحات کی حسین و جمیل کتاب جسٹس میاں شاہ دین کی سوانحعمری نہیں۔ یہ درحقیقت مرقع ہے ہماری انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے پہلے ربع کی حیات ملی کا۔ میاں صاحب مرحوم سرسید کی تحریک کے پیامبر اور (سابق) پنجاب میں اس کے اولین علمبرداروں میں سے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ابتدائی دور (۱۹۰۶ ـــ ۸) کے معماران میں سے بھی تھے۔ اور پنجاب چیف کورٹ کے پہلے مسلمان جج بھی۔ اس کتاب میں ان کے کوائف حیات اس انداز سے پیش کئے گئے ہیں کہ اس دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ہمیں افسوس یہ ہے کہ میاں بشیر احمد صاحب نے کتاب کے اس حصے کو بڑا ہی مختصر کر دیا ہے۔۔۔ اس کے حصے میں صرف ۸۰ صفحات آئے ہیں۔ معاف فرمائیے۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔ باقی حصہ میاں صاحب مرحوم کی تقاریر، بیانات اور مضامین پر مشتمل ہے۔ یوں کہئے کہ پہلے حصہ میں اس دور کے کوائف، کچھ میاں شاہ دین اور کچھ میاں بشیر صاحب کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں یہ سب کچھ جسٹس شاہ دین مرحوم کی زبانی سنائی دے رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں ہماری قوم نے کیسے کیسے بلند انسان پیدا کئے۔ اور اس کے بعد ہمیں کیا ہو گیا! یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

جہاں تک میاں شاہ دین مرحوم کا تعلق ہے ان کی سوانح حیات اور تقاریر اور مضامین سے جہاں ان کے خیالات

کی بلندی اور نگاہ کی وسعت پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے وہاں ان کی سیرت کی پاکیزگی اور کیریکٹر کی پختگی غیر شعوری طور پر ایک گہرا نقش دل پر چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس سے ان لوگوں کے نقوشِ قدم آنے والوں کے لئے نشانِ راہ بن جاتے ہیں۔ اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ —— ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما —— ہم میاں بشیر احمد صاحب کو ان کی اس حسنِ کاوش پر دلی تبریک و تہنیت بھیجتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کتاب کا اردو ایڈیشن بھی شائع کریں کہ ان سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہو سکتا ہے کہ —— گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے۔

صوری حیثیت سے بھی کتاب میاں بشیر احمد صاحب کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار ہے اور (غالباً) انہی سے (۲۲ لارنس روڈ۔ لاہور کے پتہ سے) مل سکتی ہے۔ ایسی خوبصورت کتاب کی قیمت دس روپے عام ناشرین کے لئے قابلِ تقلید شان ہے۔

۲۔ زنجیرِ رمِ آہو

قارئین کو معلوم ہے کہ طلوع اسلام کے صفحات، شعر و شاعری سے متعلق کتابوں پر تبصرہ سے ایک عرصہ سے نا آشنا ہیں۔ لیکن بعض اتفاقات عجیب نشاط انجام ہوتے ہیں اور انہی میں ایک اتفاق وہ ہے جو زیرِ نظر کتاب کے تبصرہ یا یوں کہئے کہ تعارف پر منتج ہوا۔ یہ مجموعہ ہے محترم عبدالعزیز خالد کی غزلوں اور نظموں کا جسے مطبوعاتِ مشرق۔ ہرمزجی اسٹریٹ کراچی نے خوبصورت ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا ہے۔ جناب خالد انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسر ہیں جنہیں واسطہ پڑتا ہے (بالعموم) کاروباری لوگوں سے اور جن کی کام کاج کی زبان انگریزی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہیں السنۂ شرقیہ پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی کے نادر اور پرشکوہ الفاظ کا ایک سیلاب ہے جو امنڈے چلا آرہا ہے اور قدم قدم پر تنگ دامانیٔ اشعار کا گلہ طراز ہے۔ ایسی تنگ دامانی میں کشادگی پیدا کرنے کے لئے خالد صاحب بڑی اچھوتی تراکیب وضع کرتے ہیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے ہم نے اس کتاب کا تعارف ضروری سمجھا ہے۔ چند ایک الفاظ اور تراکیب ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں۔

(۱) صبح عشرت اعتبار و شامِ نغمہ بار ہیں

(۲) برہنہ سر تو ہیں پہ ہیں رقیبِ گردشِ دہر
یہ خاکسارِ جہاں —— بے لوا۔ دریدہ قبا۔

(۳) سبزہ آوارہ۔ صبا بیگانہ۔ گل نا آشنا۔ ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
برگ ہائے لالہ یا اوراقِ مرجانِ لخت لخت — غمزۂ غماز ہے یا سرمۂ دنبالہ دار
ارضِ پاکستان ہو آفاق میں والا گہر — سلکِ مروارید گردوں اسکے طالع پر نثار

(۴) ارتفاعِ فن سے مٹ جاتا ہے محرومی کا درد — نکہتِ فردا۔ حسرتِ دوشینہ۔ تصدیعِ خمار

یا مثلاً :-

(۵) لفظ و معنی کے طلسماتِ تشکرت آہنگ میں

(۶) جل اٹھیں فکر و نظر کے آبگوں نقش و نگار
آوۂ غیرتِ غاسق۔ کوکبِ دری جیسے

(۷) یا یہ الفاظ و تراکیب -

اک بیاباں لالہ کاری، اک نیستان آرزو
شعلہ وش۔ مستانہ آوارہ۔ تماشا آشنا!
محشر آرا۔ تہ نشیں۔ تہ دار۔ شہر رنگ و بو
وقفِ اندوہ و تمنا۔ رہینِ ذوقِ جستجو
برگِ گل اوراقِ محسوسات کا شیرازہ بند

(۸) بیج چہرے کے اجلے اجلے نقوش کا دلربا تقدس
سبو میں ڈھل کے رہینِ ناموسِ میکدہ ہے۔

یا یہ کہ

(۹) تمہیں مبارک نشیدِ قلقل سرودِ انجم۔ صفیرِ بلبل
جنونِ مشاطگیِ کاکل زہے تجرِ تہے تغافل
مجھے تمنائے سرمدی نے عطا کیا ہے
گدازِ الحانِ ساربانہ
مذاقِ طوفِ دیارِ حرماں
سریرِ خاکسترِ مغیلاں

(۱۰) حل ہو گئے شفق میں ناسفتگانِ گردوں

(۱۱) یہ دلِ آذر نفس، جس کو نشیمن قفس!
خونِ رگِ صاعقات، خانہ خسِ آشیاں

کتاب کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں اس قسم کے الفاظ اور تراکیب نہ ملتی ہوں ۔۔۔ اور خالد صاحب کی اسی انداز کی متعدد کتابیں اور بھی شائع ہو چکی ہیں (مثلاً داغِ دل۔ ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ سرودِ رفتہ۔ سلوی۔ غزل الغزلات وغیرہ) اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ انہوں نے اردو لٹریچر میں کس قدر اضافہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں بڑا قحط الرجال ہے جس کی وجہ سے جس شخص کو جس مقام پر ہونا چاہیئے وہ وہاں نہیں ہوتا اس لئے ہماری بہت سی مساعی ثمر بار نہیں ہو تیں یا جو قابلِ تحسین ہیں وہ لوگ جو جس مقام پر ہوں اپنے ذوق کی چنگاری بجھنے نہیں دیتے اور جو کچھ ان سے بن پڑتا ہے کرتے ہی رہتے ہیں۔

باسمہ تعالیٰ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی
ہزار حیف نہ بینی ——

قیامت ہے موجود

پرویز صاحب کا استقبالیہ

جس سے انہوں نے طلوع اسلام کنونشن سنہ ۱۹۶۳ء کے مندوبین کو

خوش آمدید کہا

ادارہ طلوع اسلام - لاہور

ایکہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی
ز آتش صہبائے من بگداز مینائے مرا

عشق را سرمایہ ساز از گرمیٔ فریادِ من
شعلۂ بیباک گرداں خاک سینائے مرا

چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز
تازہ کن داغِ مرا سوزاں بہ صحرائے مرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادہ کشانِ خمکدۂ قرآن کے نام۔

ساقی! قدحے کہ دورِ گلزار گذشت	مطرب! غزلے کہ وقتِ گفتار گذشت

اے ہم نفس! از بہرِ دلِ زار بگو	افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت

یارانِ میکدہ! سلام و رحمت۔

یہ ساعت کس قدر سعید، اور یہ لمحۂ زندگی کیسا درخورِ ہزار تبریک ہے کہ آپ احباب، ایک سال کی طویل مدت کے بعد اپنے ولولۂ شوق کو دلوں میں لئے، پھر یکجا جمع ہوئے ہیں کہ کچھ وقت کے لئے کشاکشِ روزگار سے الگ ہٹ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ خدائے لم یزل کی وہ شمعِ جہاں تاب جسے صدیوں سے پیرانِ حرم کی مقدس آستینوں نے چراغِ تہِ داماں بنا رکھا ہے، کس طرح پھر سے وجہِ نورانیتِ عالم بنے۔ کس قدر حسین ہیں یہ آرزوئیں جو آپ کو اتنے دور دراز سفر کے بعد کشاں کشاں یہاں لے آئی ہیں اور کیسا عظیم ہے وہ مقصد جس کے لئے آپ نے یہ صعوبات برداشت کی ہیں۔ میں جب آپ احباب کے اس جذب و کیف میں ڈوبے ہوئے اجتماعِ سادہ و رنگین پر نظر ڈالتا ہوں تو میری نگہِ شوق بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ

نور ہی نور ہیں در و دیوار!	کون سا چاند گھر میں اترا ہے!

برادرانِ عزیز! یہ جو ہم نے وقت کے کارواں سے فرصت کے چند لمحات چھین لئے ہیں تو آؤ ان میں

رسمِ مہر و وفا کی بات کریں	پھر کسی دل رُبا کی بات کریں

سخت بیگانۂ حیات ہے دل	آؤ۔ اس آشنا کی بات کریں

گیسوؤں کے فسانے دُہرائیں	اپنے بختِ رسا کی بات کریں

کس قدر قابلِ صد رشک ہیں زندگی کے وہ لمحات جو "رسمِ مہر و وفا" کی باتوں میں گزریں۔

عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازلی کشمکش

سوال یہ ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ "ازل سے تا امروز" شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آرہا ہے۔ یہ کون سی کشمکش ہے جس کا سلسلۂ دراز' نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے۔ اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قومیں آئیں اور چلی گئیں۔ سینکڑوں نظام اُبھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے۔ لیکن وہ کون سے ایسے حریفانِ ازلی ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ ہر دور اور ہر مقام میں بدستور جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ کشمکشِ پیہم — وہ ستیزِ مسلسل — وہ آویزشِ متواتر۔

دین اور مذہب کی جنگ

ہے جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی' اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت، سرمایہ پرستی وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ یہ اور اس قسم کے دیگر مستبدانہ تصورات اور نظام' مذہب ہی کے سہارے قائم رہے ہیں اور جب دین نے مذہب کو مٹایا تو پھر اس کے ساتھ یہ خود بخود مٹ گئے۔ اس لئے اصل کش مکش دین اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی چیرہ دستیاں

مذہب کا تصور' مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور انہیں دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پڑیں۔ یہ انہیں بلاجرم و قصور گالیاں دیں اور وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ ان سے ہر قسم کی خدمت اور بیگار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل' اپنی زندگی کا مقدس ترین فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں۔ اپنے بچوں کے گلے پر چھری پھیر دیں۔ آگ میں کود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں۔ تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ جائیں۔ ان کی رتھوں کے آہنی پہیوں کے نیچے آکر کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں' انہیں کھڑا کردیں' اور وہ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑایا جارہا ہے' ان کی جانیں لیتے اور اپنی جانیں دیتے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو نعمتیں کھلائیں۔ اپنے بچوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے کتوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھروں کو حریر و اطلس کے لبادے پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی

کے دان کا نہیں اور ان کی ہڈیوں کی راکھ پر سنگِ مرمر کی فلک بوس عمارات استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی اُن کے دِل پر اِن کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ اِن کے تصور سے ڈرتے کانپتے لرزتے سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت اُن بلے چاروں کے اعصاب پر چھلاوے کی طرح سوار اور اُن کے ذہن پر بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ اِن کے پنجہ کی آہنی گرفت کو کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقل فریب کار نے تراشا اور جسے کمزوروں اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثر ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخواں شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوتیں فراہم اور ہزار قسم کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب شکار ان کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی وسیہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں ——— صید، خود صیاد را گوید بگیر ———

مذہب کی گرفت

اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے اٹھا کر چومیں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب نے اپنی تمام مہرہ بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ کرنا چاہا اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے، اس کے لئے اس نے پیش بندی یہ

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دور رکھا جائے اور عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔ جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل باتوں پر یقین ظاہر کرے، اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔ ارباب مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہم پرستیوں پر ایمان کا مدار، اور عجوبہ پسندیوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل، اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ مذہب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدہ یا مسلک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے ——— اور عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جا سکتا ہے، مذہب کی تاریخ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خونریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدس نام پر ہوئی ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے حصہ میں

ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے اربابِ مذہب اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مذہب کا سارا مدار عوام کے جذبات پر ہے اس کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت آتی رہے، اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس مذہب کا اجمالی سا تعارف جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے۔ اور جس نے نوعِ انسان کی نس نس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

خدا کا دین

اور یہی ہے عزیزانِ من! اس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوعِ انسان کو چھڑانے کے لئے، خدا کی طرف سے دین آتا رہا۔ اس دینِ خداوندی کے پیامبر حضرات انبیائے کرامؑ تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو اس چنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور اربابِ مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں اربابِ اقتدار، ان کی پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حامی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین، ان کے حق میں بھی موت کا پیغام تھا۔ وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود ان کی ہستی کا راز مضمر تھا۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آ رہی ہے، اور اسی کو علامہ اقبالؒ، چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملّا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ الزقوم اور اس کی پروردہ شاخیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری۔

دین اور مذہب کی کشمکش

قرآن کریم، دین اور مذہب کی اس کشمکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ اس کشمکش کی ابتدا حضرت نوحؑ کی اس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رُو سے انہوں نے، مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی محکومیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ اے میری قوم کے لوگو! تم، مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت اور محکومیت کی زنجیروں کو توڑ دو۔ اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اس آزادی کی آواز کے خلاف، اربابِ مذہب اور ان کے پشت پناہ اہلِ اقتدار ــــ یعنی مترفین طبقہ کے لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے، یورش

کرکے آگے بڑھے۔ انہوں نے عوام کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ (۲۳/۲۴)۔ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ تمہارے آباؤ اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ یہ تمہیں تمہارے بزرگوں کی روش سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ (۲۳/۲۵)۔ یہ پاگل ہے اس کی کوئی بات نہ سنو۔

اس کے بعد قرآن کریم نے سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی ایک ایک کڑی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی تھی کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گزار بنائے۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جاسکتی ہے جنہیں وہ (بذریعہ وحی) اپنی کتاب میں دیتا ہے۔ وہ یہ دعوت دیتے رہے اور ان کے خلاف ہر زمانے میں، اور ہر مقام پر مذہبی پیشوائیت اور اربابِ ثروت و اقتدار متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوتے رہے۔ ان کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی سلوگن تھا اور وہ یہ کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳)۔ یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ کردے۔ اس لئے اٹھو۔ اسے پکڑو۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸)۔ اسے زندہ جلا دو اور اس طرح اپنے خداؤں کا بول بالا کرو۔

حضرت عیسیٰؑ کی انقلابی آواز

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ بنی اسرائیل کے احبار و رُہبان نے ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں انہیں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے۔ صرف سزائے موت کے لئے انہیں رومی حکام کی منظوری لینی پڑتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت، مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان کے اس پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے تھی۔ یروشلم کا ہیکل ان مذہبی پیشواؤں کا مرکز تھا۔ داعیٔ انقلابِ آسمانی، حضرت عیسیٰؑ اسی ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور انہیں للکار کر کہتے کہ

> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ ہی داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔
>
> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔
>
> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔

اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔

(انجیل متی۔ باب ۲۳)

ظاہر ہے کہ مذہبی اجارہ دار، جو اپنی خدائی مسندیں بچھا کر، عوام کو لوٹتے اور ان پر حکومت کرتے تھے، اس انقلابی دعوت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اسے، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے کس طرح موت کا پیغام سمجھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس چیخ اور پکار سے لگ سکتا ہے جسے انجیل برنباس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ۔

مخالفت کیوں؟ تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے ..... اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیے کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ جیسے ہم ان کی شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کر لیں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے اور قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا۔ جب تک خدا کی عبادت (اطاعت) ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس صـ ۱۴۲)۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس آسمانی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ ..... بس وہی ایک وجہ! یعنی اگر خدا کا قانون رائج ہو گیا تو ہم اپنی ان مسندوں سے الگ کر دئے جائیں گے اور چونکہ ہمیں کوئی کام کاج آتا نہیں جس سے ہم اپنی روٹی کما سکیں۔ اس لئے ہمیں اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ آپ نے دیکھا کہ جسے مذہبی سوال کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت یکسر معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔

انجیل برنباس کے اس بیان سے آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس انداز حکومت کو پسند کرتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں۔ یعنی امور مملکت، حکومت کے پاس رہیں اور امور شریعت (پرسنل لاز) مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دئے جائیں۔ نہ مذہبی پیشوائیت، حکومت کے معاملات میں دخل دے اور نہ ہی حکومت ان کے حیطۂ اقتدار میں دخیل ہو۔

نبی اکرمؐ کی دعوت اور آخر میں اس عظیم و جلیل داعیٔ انقلاب کو دیکھئے جس پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ ہو گیا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ حضورؐ کے ظہور قدسی کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ نوع انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کرے گا جن میں وہ جکڑے چلی آرہی ہے اور ان کے سر سے وہ بوجھ اتار دے گا جس کے نیچے وہ بری طرح دبی آرہی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے بھی وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک مسلسل و متواتر پیش ہوتی چلی آرہی تھی اور مترفین کے طبقہ کی طرف اس کا جواب بھی وہی ملا جو شروع سے ملتا چلا آرہا تھا۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۔ جو بات یہ شخص کہتا ہے اسے ہم نے اسلاف کے مذہب میں کہیں نہیں سنا۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷) یہ غلط، جھوٹی اور بنائی ہوئی بات ہے۔ یعنی اس کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی — اس کے بعد اس طبقہ کی طرف سے جو کچھ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاء کے ساتھ ہوا، اس پر قرآن شاہد اور تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

نبی کے بعد کیا ہوتا تھا

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ، خدا کا سچا دین انسانوں کو دے جاتے تھے تو اس کے بعد اس دین کے ساتھ کیا بیتتی تھی کہ بعد میں آنے والے نبی کے وقت، سابقہ نبی کے پیش کردہ دین کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نبی کی اولیں مخاطب (بالعموم) وہی قوم ہوتی تھی جو اپنے آپ کو سابقہ نبی کی متبع کہتی تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ آنے والا نبی اس قوم کے مسلک کو باطل قرار دیتا تھا اور یہ قوم اس نبی کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ جب ایک نبی دین خداوندی دے کر چلا جاتا تو اس کے بعد اس قوم میں ایسے مفاد پرست لوگ پیدا ہو جاتے جو اس دین کو اپنے خیالات کی آمیزش سے، مذہب میں تبدیل کر دیتے۔ لیکن لوگوں سے کبھی یہ نہ کہتے کہ یہ ہمارے خیالات ہیں۔ وہ اسی مذہب کو خدا کی سچی تعلیم کہہ کر پیش کرتے۔ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ وہ خود شریعت وضع کرتے اور کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ ایسا کیوں کرتے؟ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا — (۲/۷۹) تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لئے جائیں۔ چنانچہ اس طرح خدا کا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا۔

مذہب اور دین کا تقابل

یہ عجیب بات ہے کہ جب دین اس طرح مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کچھ جزوی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں یا مذہب، دین کی پست سطح کا نام ہو۔ یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے مذہب اور دین کا تقابلی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ

مذہب: خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین: اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔

مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کا ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔

مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔

مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں ؟

مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔

مذہب عقل کے دیئے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ جلے۔

مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔

مذہب، لوگوں کو روشنی سے، تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ۔ (۲/۲۵۷)۔

مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پر چلتے جاؤ۔

مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔

اس لئے مذہب، ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔

دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔

دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب

دین عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگا اٹھیں۔

دین اپنے ہر دعوے کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

دین انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۵/۱۶)۔

دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن حرام است

دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

دین تیشۂ براہیمیؑ سے ہر قدیم اور جدید بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

دین کا پیغام ہے کہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر کڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔	دین اُسے دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔
مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ بدریا در منافع بے شمار است دگر خواہی سلامت برکنار است	دین کی پکار یہ ہے کہ بدریا غلط و با موجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
مذہب، مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔	دین مادہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔
یعنی مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت دلاتا ہے۔	اور دین اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔
مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
مذہب، کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔	دین، ظلم و استبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔
مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ کہئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں	دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ ناسازگار حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎ [illegible]

مذہب	دین
مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ لسوڑنا اور سو تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷/۳۲) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہو۔
مذہب موت کی سسکیاں ہیں۔	دین زندگی کے قہقہے۔
مذہب ایک خواب پریشاں ہے	دین، زندہ حقیقت۔
مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ - زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔	دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر، مُردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔
مذہب انسانیت کی موت ہے۔	دین ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
دین[1] دمِ جبریلؑ - دینِ دلِ مصطفیٰؐ	دین خدا کا رسول - دین خدا کا کلام!
دین فقیہِ حرم - دین امیرِ جنود	دین ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات	دین سے نورِ حیات - دین سے نارِ حیات

یہ ہے وہ دین جو مذہب میں تبدیل ہو کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سچ کے نقاب میں پیش کرتا ہے۔ مذہب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ دین کے الفاظ اصطلاحات۔ رسوم و مناسک اسی شکل میں قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ یہی دین کے وہ بے روح خد و خال ہیں جن سے مذہب عوام کو دھوکا دیتا ہے۔ مذہب درحقیقت دین کی ممی شدہ لاش کا نام ہے۔

اسلام کے ساتھ یہی کچھ ہوا

دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوام سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآن کریم میں مکمل کیا۔

---

[1] اصل اشعار میں "دین" کے بجائے "عشق" کا لفظ ہے۔

اور حضورؐ نے اس قرآن کو امت کو دے دیا۔ لیکن حضورؐ کی تشریف براری کے تھوڑا عرصہ بعد، مفاد پرست قوتوں نے ابھرنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پہلے ملوکیت آئی۔ اس کے ساتھ سرمایہ داری۔ اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لئے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا جس طرح سابقہ انبیائے کرامؑ کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس دین کا ضابطہ ـــــ قرآن کریم ـــــ اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ لیکن اس کتاب کا محفوظ رہنا، مذہب کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے اور اس طرح اسے ایک ضابطۂ حیات کے طور پر غیر موثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رسول اللہؐ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا تھا جو دین کو اس کی اصلی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دین، قرآن کریم کے اندر منضبط تھا اور قرآن حرفاً حرفاً محفوظ۔ اس لئے اب دین کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآن کریم کو عملی زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریک پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی کا رہینِ منت ہے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآن کریم مسلمانوں کی عملی زندگی کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جا سکیں۔ غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ احباب کو معلوم ہے کہ تحریک پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز، باہمگر ستیزہ کار چل رہی ہے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

تحریکِ پاکستان

تحریکِ پاکستان کی مخالفت

مذہب کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کا پورا اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے اور حکمران طبقہ ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو تھیاکریسی کہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست، حکومت کی تفویض میں رہیں اور امورِ مذہب، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ اسے سیکولر انداز حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرنِ اول کے بعد، جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مسلمانوں کی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز، حکومت کی تحویل میں تھے۔ اور پرسنل لاز ارباب مذہب کے سپرد۔ تحریک پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں دین کی حکمرانی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ دوسری طرف ہندو نے یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد

مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا۔ چونکہ یہ انداز، مذہبی پیشوائیت کو (TWIST) کرتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی — مذہب اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ہر ایک سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ لیکن دین، لاشریک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے　　عشق بے چارہ نہ صوفی ہے نہ مُلّا نہ حکیم

اسلئے تحریک پاکستان جو دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی، نہ ہندو سے مفاہمت کر سکتی تھی نہ مذہبی پیشوائیت سے۔ چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی پیشوائیت سے مفاہمت نہ کی تو اس نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہیں نیشنلسٹ یا (قوم پرست) علماء کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں ایک مختصر سا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو مذہب کے نام پر مملکت میں پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یعنی یہ طبقہ تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنی تھا۔ چونکہ دین کی نگاہوں میں تھیاکریسی بھی ایسی ہی باطل ہے جیسی سیکولرازم۔ اس لئے تحریک پاکستان' اس طبقہ سے بھی مفاہمت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا یہ طبقہ بھی — متحدہ قومیت کے نظریہ کا مخالف ہونے کے باوجود — تحریک پاکستان کا مخالف تھا۔ یہ طبقہ جماعت اسلامی کے نام سے معروف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کشمکش، کس طرح درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد

مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی ادھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کشمکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تھیاکریسی قائم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ چونکہ سیکولر انداز حکومت، مغربی ذہنیت رکھنے والے طبقہ کے نزدیک بھی زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے اسے اس معاملہ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ مفاہمت کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر یہاں اس انداز کی حکومت قائم ہو جانے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ وہ طبقہ بھی جو یہاں تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنی ہے، سردست ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کرنے پر آمادہ ہے۔ اگرچہ ان کی آخری منزل تھیاکریسی ہی ہے۔

دستورِ پاکستان

ان حضرات کی یہ کوشش دستور سازی کے سلسلے میں برابر جاری ہے۔ چنانچہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے پیش نظر یہ تجویز تھی کہ قانون سازی کے آخری اختیارات ایک علماء بورڈ کے سپرد کر دئے جائیں۔ یہ تھیاکریسی کی شکل تھی، اس لئے یہ حضرات اس پر بہت خوش تھے۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹ

گئی تو ان کی کوشش سیکولر انداز کی طرف منتقل ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کا دستور، جس کے منظور ہونے پر ان حضرات کی طرف سے شادیانے بجائے گئے تھے۔ اسی انداز حکومت کا مظہر تھا۔ اس میں پرسنل لاز کو پبلک لاز سے الگ رکھا گیا تھا اور مختلف فرقوں کے وجود کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین سے بہتر ہے کہ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی گئی ہے۔ اور نہ ہی مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ۱۹۶۲ء کے آئین کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کے دستور کا اسلامی حصہ اس دستور میں شامل کیا جائے۔

عائلی قوانین کی مخالفت

آپ نے برادران عزیز! کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ حضرات، ملک کے تمام قوانین کو چھوڑ کر، عائلی قوانین کی تنسیخ کے لئے اس قدر شور کیوں مچا رہے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اس قدر ایسے ایسے قوانین رائج ہیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ مثلاً یہاں زناکاری قانوناً جائز ہے۔ عصمت فروشی کے بازار ہر شہر میں کھلے ہیں۔ علاوہ بریں، ایک بالغ لڑکے اور لڑکی کا باہمی رضامندی سے بغیر نکاح، جنسی اختلاط قانوناً جرم نہیں۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ان حضرات کی دینی غیرت نے کبھی ان قوانین کے خلاف جوش کھایا ہو اور انہیں منسوخ کرنے کے لئے انہوں نے محاذ قائم کئے ہوں؟ یہ کیوں ہے کہ ان قوانین کے خلاف ان کی طرف سے کبھی جدوجہد نہیں ہوتی۔ لیکن عائلی قوانین کے خلاف اس قدر قیامت برپا کی جا رہی ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عائلی قوانین پرسنل لاز تھے، جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں چلے آ رہے تھے۔ قرن اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت ان قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار سے نکال کر حکومت کے دائرۂ اختیار میں لائی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اسے اپنی حدود حکومت میں دخل اندازی سمجھتی ہے اس لئے وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟ یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات ان قوانین کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں ورنہ ان قوانین میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہو۔

آپ کی دعوت

اس تمام کشمکش میں برادران عزیز! دین خالص کی طرف دعوت دینے والی آواز آپ کی طرف سے اٹھ رہی ہے، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی ساری مخالفت کا رخ آپ کی طرف ہے۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دین اور مذہب کی اس کشمکش میں اس طرف کھڑے ہیں جدھر حضرات انبیائے کرامؑ اور قدوسیوں کی وہ جماعتیں کھڑی ہوا کرتی تھیں جنہیں خدا نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ حضرات اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

چونکہ مذہب، ہر نظریہ، ہر تصور، ہر نظام اور ہر ادارہ کے ساتھ مفاہمت کر سکتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ اس کا پشت پناہ ہوتا ہے، اس لئے ان لوگوں کے پاس نہ روپے پیسے کی کمی ہوتی ہے نہ اسباب و ذرائع کی

محتاجی۔ روپے کے زور پر یہ لوگ پراپیگنڈہ کی مشینری پر قابو پالیتے ہیں اور جھوٹ کو سچ کرکے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ دین، ان قوتوں میں سے کسی کے ساتھ مقاومت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کی دعوت کو لے کر اٹھتے ہیں ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

ساماں و ذرائع کی فراوانی

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے۔

اور مختلف حیلے

پھر مذہب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربے کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتا۔ وہ سینٹ پال کے الفاظ میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

> اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔
>
> (رومیوں کے نام - ۳/۷)

وہ بڑے طمطراق سے فتویٰ دیتا ہے کہ

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔
>
> (ابو الاعلیٰ مودودی - ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۹ء)

وہ تعلیم یہ دیتا ہے کہ دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بڑے مقدس اور زریں اصول پیش کرو۔ لیکن جب اس طرح قوت حاصل ہو جائے تو پھر ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عملاً وہ کچھ کرو جس میں اپنا مفاد سمجھو۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء) اپنے مقصد کے حصول کے لئے اگر رشوت تک بھی دینی پڑے تو اسے کار ثواب سمجھو۔ البتہ اس کا نام "تالیف قلب" رکھو۔[1]

دین کا غلبہ

مذہب ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔ دین خدا کے اٹل قوانین کا نام ہے۔ اور ان قوانین کا آخر الامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے۔ خدا کے پروگرام کو دنیا کی کوئی

---

[1] حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار المنبر بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے انہیں ملتان جیل میں کہا تھا کہ کراچی جاؤ اور طلوع اسلام کے دفتر کے کسی شخص کی تالیف قلب کر کے اس سے طلوع اسلام کے پتے حاصل کرلو۔

قوت شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن (جیسا کہ آپ احباب کو اچھی طرح معلوم ہے) حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال، بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ جن ارباب فکر کی نگاہیں اُن انقلابات پر ہیں جو اس وقت دنیا کے ہر گوشے میں رونما ہو رہے ہیں، اور جنہیں علامہ اقبالؒ نے "قیامت سوچ" سے تعبیر کیا ہے، انہیں نظر آ رہا ہے کہ اب مشیت کے پروگرام کے مطابق باطل کے نظامہائے زندگی کے مٹنے کا وقت بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔ دنیا سے ملوکیت کا وجود ختم ہو رہا ہے۔ ہر نئے سورج کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاج فضا میں اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نظام سرمایہ داری، جاگیرداری، زمینداری، حرف غلط کی طرح مٹ رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی مذہب کی سحر کاریاں بھی، اجزات کی طرح ہوا میں اُڑتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ ذرا غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ انسانی قلوب و اذہان پر مذہب کی جو گرفت آج سے پچاس سال پہلے تھی، وہ بڑی حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

مذہب کا انجام

ہندوستان سے سناتن دھرم بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے بدھ مت کا مامن و مسکن چین تھا۔ اُسے وہاں سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ تبت ان کے خدا (دلائی لاما) کا پایہ تخت تھا۔ وہ وہاں سے بیک بینی و دوگوش نکالے جا چکے ہیں اور اب اپنی جان کی حفاظت کے لئے دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہودیت، مذہب کو چھوڑ کر سیاست میں بدل چکی ہے۔ عیسائیت کی قدیم عمارت کا وسطی ستون، پوپ ہے۔ اس نے ابھی پچھلے دنوں جس نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ اس کا اقتدار بھی خطرہ میں ہے۔ غرضیکہ مذہب کی دنیا میں آپ جہاں بھی دیکھیں گے آپ کو نظر آ جائے گا کہ

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل ۔۔۔ بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جب ساری دنیا میں مذہب کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب (دین نہیں، مذہب) جو ہمارے ہاں رائج ہے، باقی رہ جائے گا؟ اس وقت سوال اِس مذہب یا اُس مذہب کا نہیں۔ سوال نفسِ مذہب کا ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ کہنا کہ دوسروں کا مذہب باطل ہے اور ہمارا مذہب حق۔ اس لئے یہ فنا نہیں ہو سکتا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر مذہب کے علمبردار یہی کہتے ہیں۔ لیکن مذہب حق پر ہوتا ہی نہیں۔ حق تو خدا کا دین ہوتا ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اس لئے مذہبی مفاد پرستوں کی ہزار کوششوں اور مقدس آرزوؤں کے باوجود یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے عرصہ ہوا، لیگ آف نیشنز (انجمن اقوام) کے متعلق کہا تھا کہ۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑتی ہے ۔۔۔ ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ۔۔۔ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جو کچھ انہوں نے لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا، وہی کچھ اب انسانوں کے خودساختہ مذہب کے متعلق نظر آتا ہے۔ اس وقت اربابِ مذہب کے ہاں جذبات کی جو شدت نظر آتی ہے وہ ان کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ اس سے یہ کچھ وقت کے لئے فضا میں انتشار اور معاشرہ میں خلفشار تو پیدا کر سکتے ہیں، اپنی مسندوں کو گرنے سے بچا نہیں سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں ختم کر کے دیں گے۔

لا و اِلّا

لیکن برادرانِ عزیز! جب باطل، زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو اس میں ایک نقص رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ یہ تقاضے صرف باطل کو مٹاتے ہیں، اس کی جگہ، حق کا نظام ساتھ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلا رہ جاتا ہے جسے قانونِ خداوندی کی کائناتی رفتار کے مطابق پُر کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں زمانے کے تقاضے "اللہ کے نشتر" ہوتے ہیں جو فصد کھول کر کثیف خون باہر نکال دیتے ہیں۔ لیکن اس کی جگہ صالح خون ساتھ کے ساتھ پیدا نہیں کرتے۔ یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہوتا ہے جو دین کا نظام قائم کرنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ وقت جب زمانے کے تقاضے باطل کے کسی نظام کو مٹا رہے ہوں، ان لوگوں کے لئے بڑا سازگار بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا صعوبت انگیز بھی۔ سازگار تو اس لئے کہ ان کا آدھا کام ـــــ یعنی لا اِلٰہ کا مرحلہ ـــ زمانے کے تقاضے یا اللہ کے نشتر پورا کر دیتے ہیں۔ انہیں اس ہموار شدہ زمین پر اِلّا اللہ کی عمارت استوار کرنی ہوتی ہے۔ لیکن پُر از صعوبات اس لئے کہ جس طرح ایک بھوت "نکلتے وقت بڑی دہشت انگیز نشانی پیچھے چھوڑتا ہے"، باطل کی قوتیں نزع کی حالت میں بڑی سخت ملکہ کو بلی کرتی ہیں ـــــ بدر و حنین کے میدان باطل کی قوتوں کے اسی رقصِ بسمل کی یادگار ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آئینی دور میں، کم از کم پاکستان میں، ان رزمگاہوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تھیاکریسی قائم کرنے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بہت پہلے اپنے اس پروگرام کا اعلان کر دیا تھا۔ جب کہا تھا کہ

> اسلام جب اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطباتِ مودودی صفحہ ۲۲۵)

طلوعِ اسلام کا پروگرام

طلوعِ اسلام کا پروگرام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نہایت پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرتے جانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر کوئی پروگرام نہیں ـــ حتیٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت ہے، ہمارے پاس ان کی بے حد کمی ہے۔ لیکن وہ جو قرآن نے

کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اٹھو تو خدا کی کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی۔ یہ اس کا اثر ہے کہ سامان و ذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جارہی ہے وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ آپ ذرا دس بیس برس پہلے اُدھر کا نقشہ سامنے لایئے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے، آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح، خاموشی ہی خاموشی سے، ہر گوشے کو متاثر کئے جارہی ہے۔ اور یہ حقیقت کس طرح ایک واقعہ بن کر سامنے آرہی ہے کہ۔

حُسن کے رازِ نہاں شرحِ دبیاں تک پہنچے ۔۔۔ آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی۔ آنکھ نے دل سے کہہ دی ۔۔۔ بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت و صداقت کے معترف تو ایک طرف، اس آواز کے شدید ترین مخالف بھی، اپنے مواعظ اور تقاریر میں، قرآن کی آیات۔ دین کی اصطلاحات اور نظامِ خداوندی کے استعارات، استعمال کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔

جناب شیخ اوضو کے لئے ہی، لیکن ۔۔۔ کسی بہانے لب جو نکل ہی آئے ہیں

اس سے بھی بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ یہ آواز اب، پاکستان کی حدود سے آگے نکل کر مغربی ممالک میں بھی

مغربی ممالک میں آواز

پھیلتی جارہی ہے۔ پچھلے سال میں نے آپ احباب سے ذکر کیا تھا کہ کس طرح ایک جرمن مصنف نے اپنی پاکستانی سیاحت کی روئداد کے سلسلہ میں یہ لکھا تھا کہ یہاں ایک ہی تحریک قابلِ ذکر ہے۔ اور وہ طلوعِ اسلام کی تحریک ہے۔ اب حال ہی میں ایک کتاب ہالینڈ سے شائع ہوئی ہے کتاب کا نام ہے (MODEN MUSLIM KURAN INTERPRETATION) اور مصنف کا نام (M. S. BALJON جی) اس میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں قرآن کی جدید تعبیرات کی کوششیں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پاکستان سے صرف دو مصنفوں کو منتخب کیا ہے۔ ایک علامہ مشرقی اور دوسرے آپ کا یہ رفیق ـــ اس نے سلسلۂ معارف القرآن اور سلیم کے نام خطوط وغیرہ کا براہ راست (اردو سے) مطالعہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کے اقتباس پر اقتباس دئے چلا جاتا ہے۔ وہ میری زندگی کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ۔

پرویز کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر بلند پایہ ادیبانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلّم ہے جسے فطرت نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لئے جو مذہب سے برگشتہ ہورہے ہیں اور ان کی زندگی کی کشتی کو لنگر کی ضرورت ہے۔ ایک مشفق دوست ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتا ہے اس کے متعلق نہایت محکم اور آزاد رائے رکھتا ہے۔ اور نہایت معقول نتیجہ پر

پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصر حاضر کے تقاضوں پر بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کا اثر بڑھتا چلا جائے گا۔ (صـــ)

مصر سے آواز

مصر کے علامہ سید احمد التیقی کے مضامین کے تراجم، طلوع اسلام کی گزشتہ اشاعتوں میں آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ان مضامین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان پر علامہ موصوف کا نام نہ لکھا ہو تو پہچانا نہ جا سکے کہ یہ مضامین خود طلوع اسلام کے ہیں یا ان کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ علامہ تیقی کے علاوہ مصر میں اور علماء بھی ہیں جو اسی نہج سے قرآن پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان ممالک نیز یورپ اور امریکہ سے مطالبات موصول ہوتے ہیں کہ طلوع اسلام کا لٹریچر انہیں بھیجا جائے۔ چنانچہ اب میں مغربی ممالک کی اہمیت کے پیش نظر اپنی بیشتر توجہ انگریزی لٹریچر کی طرف دے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب قرآن اپنی اصلی شکل میں ان ممالک کے ارباب فکر و نظر کے سامنے آیا، تو وہ اس کا استقبال آگے بڑھ کے کریں گے۔ وہ اپنے غلط تصورات اور باطل نظام زندگی سے سخت تنگ آئے ہوئے ہیں اور کسی جدید نظام کے لئے بے حد مضطرب و بے قرار نظر آتے ہیں۔ مذہب ان کی تسکین نہیں کر سکتا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مذہب کے ہاتھوں تنگ آکر ہی زندگی کی کسی نئی شاہراہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور یہ شاہراہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ کیا عجب ہے کہ اگر ان کے سامنے خدا کا دین اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو جس آدم نو کے انتظار میں زمانے کی آنکھ بار بار اٹھ رہی ہے اس کی نمود وہیں سے ہو جائے۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ

اسی امید پہ بیٹھا ہوں سر راہگذر — ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہو گی۔

قرآن کا مطالبہ

برادران من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا میرے دل پر خاص اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں، اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود اس دیے کو اپنے خون جگر سے روشن رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآن کریم ہم سے جو توقعات وابستہ رکھتا ہے ہم انہیں کما حقہ پورا نہیں کر رہے۔ یہ تو اس کی کشادہ دلی اور وسعت ظرف ہے جو وہ ہمیں اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حق بات یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اتر رہے۔ قرآن کو ہم سے بہت سے شکوے ہیں اور بالکل بجا شکوے۔

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم — وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

اس کے وابستگان دامن کو تو جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا بیعانہ تک بھی ادا نہیں کر سکے۔ اس لئے میں آپ احباب سے درخواست کروں گا کہ آپ اس باب میں

عالمگیر انقلاب

مزید ہمت کیجئے۔ انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، قدیم تصورات حیات، اور نظامہائے زندگی کا دور ختم ہو چکا ہے ـــ ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب سب

ایک ایک کرکے اٹھتے اور مٹتے جارہے ہیں، اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے! — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا! — تماشا دکھا کر مداری گیا

زمانے میں انقلابات اس تیزی سے آرہے ہیں، یا کروٹیں بدل رہے ہیں، لیکن جس امّت نے ایسے مقام پر کاروانِ انسانیت کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنی تھی اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ،

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امّت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس وقت لا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں اس کے بعد ان کے مقام سے ہٹانے یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے۔ اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے۔ جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے اس لئے،

ایکہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

حدی را تیز تر می خواں

قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ جب اس کی عظمت انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یہ اس میں عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی مخالفت اس کے جذبۂ سرشاری کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ (۳/۱۷۳)۔ یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے، تو اس سے ان کے ایمان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے، ہمارے ساتھ اللہ کی تائید و نصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے شیفتگی انسان کو کسی مقام پر بھی دل گرفتہ نہیں ہونے دیتی۔ وہاں تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

مجھ کو راس کر گیا حبیب کا سلوکِ انجمن — اٹھ کے نگاہِ دلبری، ہاتھ میرا دبا گئی

اس لئے برادرانِ گرامی قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیجئے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیے۔

میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں عزیزانِ من! ایک اور جذبہ بھی کارفرما ہے اور اگرچہ وہ کچھ ذاتی سا ہے لیکن میں اسے اپنے آپ سے خیانت سمجھتا ہوں کہ وہ دل میں بار بار اُبھرے لیکن اسے زبان تک نہ لاؤں۔ یوں

میری بیماری

تو میری صحت کبھی بھی اطمینان بخش نہیں رہی لیکن گزشتہ جنوری، ایک رات، ایک غیر متوقع بیماری کا ایسا شدید اور ناگہانی حملہ ہوا کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر تکلیف کی شدت اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو میں شاید صبح تک زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یہ زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا جس میں موت محسوس طور پر سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں میرے پیشِ نظر پروگرام کا جو حصہ ابھی ناتمام ہے، میری للچائی ہوئی بے بس نگاہیں اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ طوفانی حملہ بخیریت گزر گیا لیکن اس کے بعد یہ احساس بڑی شدت اختیار کر گیا ہے کہ جو کام میرے سامنے ہے وہ کسی نہ کسی طرح میری زندگی میں تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آرزو بڑی حسین اور یہ تمنا بڑی معصوم ہے۔ لیکن فطرت کے اٹل قوانین کسی حسین آرزو اور مقدس تمنا کی رعایت نہیں کیا کرتے۔ ہم تو کس حساب شمار میں ہیں، اس باب میں تو اس ذاتِ اقدس و اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) تک سے بھی جس کی نظیر دنیا نے پھر نہیں دیکھی، یہ کہہ دیا گیا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) جن انقلابی تبدیلیوں کے متعلق ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض تیری زندگی میں سامنے آ جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیری وفات اس سے پہلے ہی ہو جائے۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ کب رونما ہوتی ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچاتے جاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس کے نتائج محسوس شکل میں کب سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ تو نہ میں کہہ سکتا ہوں نہ کوئی اور، کہ جو پروگرام میرے پیشِ نظر ہے اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن جی ضرور یہ چاہتا ہے کہ کسی حد تک ہی سہی، اس کی تکمیل میرے سامنے ہو جائے۔ آپ احباب نے، اس وقت تک میرے پروگرام کی تکمیل کے لئے، جس مخلصانہ رفاقت کا ثبوت دیا ہے اس کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ

میری آرزو

آپ جیسے رفقائے سفر ہر رہروِ حیات کو نصیب کرے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ اس پیغام کو مغربی ممالک تک پہنچانے کے علاوہ، ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں نونہالانِ ملت کی تعلیم و تربیت خالص قرآنی خطوط پر ہو اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ اس چراغ کو بدستور روشن رکھیں اور میں مرتے وقت یہ کہہ سکوں کہ

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من   کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

کس قدر پرسکون ہوگی ایسی موت جس پر ہر دیکھنے والا بے ساختہ پکار اٹھے کہ۔

نسبت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت ——— مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

آخر میں عزیزانِ گرامی قدر! میں ایک ایسے نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جسے اچھی طرح نہ سمجھنے سے کئی ذہنوں میں پریشانی اور بعض دلوں میں افسردگی تک پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم اتنے عرصے سے اس آواز کو بلند کر رہے ہیں لیکن لوگ اس طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے لاکھوں افراد نظر آتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ ہماری برسوں کی تگ و تاز سے گنتی کے افراد ہمارے شریکِ سفر ہوئے ہیں اور مذہب پرست طبقہ کی ایک آواز پر لاکھوں افراد ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بین وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں اور آپ اس کے چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ لوگ عوام کو انہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جنہیں وہ پہلے سے مان رہے ہیں، اور آپ انہیں ان راستوں پر چلنے سے روکتے ہیں، جن پر صدیوں سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے دو جلیل القدر نبی ——— حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ برسوں تک ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر نکلتا ہے کہ فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ۔ (پ۱۱)

گوسالہ سامری

ان پر قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ اس کے برعکس سامری انہیں ایک بت تراش کر دیتا ہے اور ساری قوم اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس میں سامری کی کاریگری اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے قوم کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور گوسالہ پرستی کے جو جذبات ان کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود تھے، ان کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا۔ یہی ہر زمانے کا سامری کرتا ہے۔ وہ قوم کی خوئے بت پرستی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذوقِ معبودیت کی تسکین کے لئے ایک نیا بت تراش کر دے دیتا ہے اور خود اس بتکدہ کا پجاری (مہنت) بن جاتا ہے۔ وہ اس بت تراشی میں بھی ایک پائی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتا۔ وہ قوم ہی کے زیوروں کو ڈھال کر انہیں ایک بت بنا کر دے دیتا ہے۔ جب تک قوم میں خوئے بت پرستی موجود ہے کسی بت ساز کو بھی پجاریوں کی کمی کی شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہر بتکدہ آباد ہوگا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس بت خانے کا مہنت زیادہ شاطر اور چالاک ہوگا اس میں چڑھاوا زیادہ چڑھے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں پہلے سے اس قدر خانقاہوں، درگاہوں اور مقبروں کی موجودگی کے باوجود ہر نئی قبر پر کس دھوم دھام سے میلہ لگتا ہے۔ اس میلے کی رونق کا راز، اس قبر کی جاذبیت میں نہیں بلکہ قوم کی خوئے بت پرستی میں مضمر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص قوم کے دل سے بت پرستی کے جذبات نکالنا چاہتا ہے اس کی منزل

بڑی کٹھن اور اس کے راستے بڑے پُرخار ہوتے ہیں۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جس میں صاحب ضربِ کلیمؑ کے ساتھ تو قوم کے چند افراد دیتے ہیں اور سامری کے پیچھے ساری قوم لگ جاتی ہے۔ یہی چار ہزار سال پیشتر ہوتا تھا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ اس لئے برادرانِ من! آپ نہ تو اپنی دعوت کے نتائج کی سست روی سے گھبرائیے اور نہ ہی سامریانِ عصرِ حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ آپ کی دعوت اُس پیغام کی نقیب ہے یا نہیں جسے خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر جانچتے رہیئے۔ اور اس کی خاص احتیاط برتیئے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لئے کوئی طریق ایسا اختیار نہ کیا جائے جو ضابطۂ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ یاد رکھئے! اس تحریک کی کامیابی کے لئے اگر آپ کا ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو وہی آپ کی شکست اور ناکامی کا مقام ہوگا۔ اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس راستے میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حُسنِ معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لئے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ کہ

جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

سفر یا آوارگی

(راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ کا خطاب جو انہوں نے ۱۲ اپریل کی شب کو طلوع اسلام کنونشن میں دیا)

صدر محترم۔ میر کارواں و ہم سفران چمن!

جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو اس اہم سوال سے دوچار پایا کہ انسان کی تخلیق کس مقصد کے لئے ہوئی ہے۔ یہ کاروانِ حیات یوں ہی بے مقصد حرکت میں ہے یا کسی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے کا انسان اپنے علم و فہم کے مطابق اس سوال کے حل کرنے میں کوشاں رہا ہے۔

خود قرآن کریم نے بھی یہ سوال کیا ہے کہ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (۲۳/۱۱۵) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے غرض و غایت، بلا مقصد یوں ہی بے کار پیدا کر دیا ہے اور دوسری جگہ کہا ہے کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (۷۵/۳۶) یعنی کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے جس کی نہ کوئی منزل ہے اور نہ نصب العین۔ نہ اس کے سفر کا کوئی مقصد ہو نہ اس کی جادہ پیمائی کی کوئی غایت۔ اس کی کیفیت یہ ہو کہ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ـــــ (۲۶/۲۲۵) جس طرف اس نے منہ اٹھایا چل نکلا۔ جس وادی میں چاہا سرگرداں مارا مارا پھرتا رہا۔

منزل کا تعین قرآن کریم کی آیات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا انسانیت کی پوری تاریخ اس حقیقت کی تفصیل نہیں کہ جب بھی کسی قوم نے اپنی منزل متعین کر کے قدم اٹھایا وہ کامیاب و کامران ہوئی۔ اور جب وہ منزل کا تعین کئے بغیر یوں ہی سرگرم تگ و تاز ہوئی کسی منزل مراد تک نہ پہنچ سکی وہ ہار تھک کر بیٹھ گئی۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ (۵/۵۳) اس کے تمام اعمال بے نتیجہ ہو کر رہ گئے۔

برادران محترم! اقوام کو چھوڑیئے۔ خود اپنی حالت پر غور کیجئے۔ اس برصغیر میں ہماری اپنی داستانِ حیات اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے کہ جب ہم نے بلا تعین منزل قدم اٹھایا، ناکامی و نامرادی کے صحرا میں بھٹکتے رہے اور جب منزل تعین کرنے کے بعد قدم اٹھایا تو منزل مقصود تک جا پہنچے۔ وہ دورِ سعید جب ہمارا قافلہ زندگی کی متعین راہوں پر قدم بڑھا رہا تھا، ہماری

قندیلوں اور کامرانیوں کے نور سے جگمگا رہا تھا۔

نشاۃ ثانیہ کے نقیب

ہماری نگاہیں جب عہد رفتہ کے طے کردہ سفر اور منزلوں کی طرف اٹھتی ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ سرسید علیہ الرحمتہ نے پہلی بار منظم طریقے سے اس برصغیر کے مسلمانوں کے احساس خودی کو اجاگر کیا انہیں جہالت کی تاریکیوں اور خواب غفلت کی سرمستیوں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہوش میں لانے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ خدا اس نقیب ملت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیونکہ انہوں نے قوم کو نئی زندگی عطا کی۔ سیاسی شعور سے بہرہ ور کیا اور ذلت اور شکست کی بھول بھلیوں سے نکالا۔ لیکن مقام حیرت و افسوس ہے کہ اس محسن عظیم کو بھی شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ کس کمبخت طائفہ کی طرف سے؟ یہ چند لمحوں میں عرض کروں گا۔

سرسید کے بعد اس برصغیر کے مسلمانوں کی خوش نصیبی نے انہیں ایک اور دانائے راز عطا کیا جس کی نگاہ بلند تھی تو سخن دلنواز تھا قلندرانہ تھی تو صدا مجاہدانہ۔ جو عقابی نگاہ بھی رکھتا تھا اور فقر غیور بھی۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کے یہ آفتاب عالمتاب حکیم الامت علامہ اقبالؒ تھے جنہوں نے نراقی معاشرہ کا نکھرا نکھرا خاکہ پیش کیا اور بڑے حسین پیرائے میں افراد ملّت کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرایا۔ پاکستان کا تصور ان کی بصیرت دینی کا رہین منّت ہے لیکن عصر حاضر کے اس عظیم و جلیل حکیم انقلاب کو بھی رہ و رسم کفر بازی کے زخم کھانے پڑے۔ یہ چرکے لگانے والے کون تھے؟ میں جلد ہی انہیں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

علامہ اقبالؒ کے اس تصور پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت اس عظیم شخصیت کے حصہ میں آئی جس کو دنیا قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے نام سے جانتی ہے۔ قائد اعظم کی ذہانت۔ فکر کی بلندی اور ارادے کی پختگی تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی ہے اور جیتے جاگتے حقائق کی روشنی میں یہ ثابت کر گئی ہے کہ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن صد حیف کہ اس بطل جلیل کو بھی مخالفین کی افترا پردازیوں کا شکار بننا پڑا۔

تحریکوں اور شخصیتوں کا باہمی تعلق

برادران محترم! ایک اور مسئلہ بھی زیر بحث چلا آرہا ہے اور وہ یہ کہ آیا ایک شخصیت کسی تحریک یا حالات کی پیدا وار ہوتی ہے یا تحریکیں اور حالات خود شخصیتوں کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ ایک فریق یہ کہتا ہے کہ اگر حالات مساعد ہوں تو شخصیت کی کامیابی ناممکن ہو جاتی ہے وہ نامساعد حالات کے بھنور میں ڈوب کر رہ جاتی ہے۔ مزید برآں اگر کوئی تحریک کامیابی کی منزلوں پر آگے بڑھتی ہے تو یہ سب کچھ اس کے اپنے زور دروں کی بنا پر ہوتا ہے۔ کسی شخصیت کے اثر کی وجہ سے نہیں۔ فریق ثانی کا موقف یہ ہے کہ انسان ہی حالات و تحریکات کا خالق ہوتا ہے اور تحریک انسان کی شخصیت کے زور سے ہی آگے بڑھتی ہے۔

برادرانِ عزیز! میرے نزدیک یہ دونوں نکتہ ہائے نگاہ انتہا پسندی پہ مبنی ہیں۔ اور مجھے ان کے درمیان نقطۂ اعتدال کی تلاش رہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تحریکیں اور شخصیتیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی تحریک کسی بلند شخصیت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اور کوئی شخص جو ذاتی اور ذہنی طور پر کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اگر کسی ایسی تحریک کا علمبردار نہیں جو بلند اقدار پہ مبنی ہو تو وہ حیاتِ طبعی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور بس۔ جریدۂ عالم پہ اس کی شخصیت کا کوئی نقش تابندہ باقی نہیں رہتا۔ آپ کسی ملک میں کسی دور کی کسی تحریک پہ نظر ڈالیں کوئی نہ کوئی بلند پایہ شخصیت ہوگی جو اس تحریک میں روحِ رواں کی حیثیت سے کام کرتی نظر آئے گی۔ اس شخصیت کے خصائص کیا ہوتے ہیں یہ ابھی عرض کروں گا۔

لیکن رفقائے گرامی قدر! کتنا بدنصیب ہوتا ہے وہ ملک جہاں نہ کسی تحریک کا جمال ہو نہ کسی ہستی کا جلال۔ اس سے بھی بڑھ کر بدنصیب ہوگی وہ قوم جو اپنے آسمانِ تقدیر کے درخشندہ ستاروں سے آنکھیں بند کر لے اور ان کی روشنی سے فیض یاب ہونے سے انکار کر دے۔ تحریک نام ہوتا ہے ان اجتماعی کوششوں کا جو کسی متعین منزل کے حصول کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ مستقیم کردار میں ڈوب کر اہلِ تحریک کسی مردِ مولا صفات کی سرکردگی میں منزلِ مراد کی جانب صورتِ کارواں جادہ پیما ہوتے ہیں۔ دوریٔ منزل اس قافلے کے لئے زادِ سفر ہوتی ہے۔ برادران۔ ابھی ابھی میں نے تین عظیم القدر شخصیتوں کے نام لئے تھے۔ سرسید احمد خان، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ۔ ان میں سے ہر ایک نے پہلے ایک منزل کا تعین کیا اور پھر اس کے حصول کے لئے ذوقِ سفر سے کام لیا انہیں دقتیں پیش آئیں ان کی مخالفتیں ہوئیں۔ ان پر کم ظرفوں نے طعنہ زنی کی تو بد اخلاقوں نے الزامات تراشے مذہبی تعصب کی تاریکیوں میں ڈوب کر مذہبی پیشوائیت کے علمبرداروں نے ان درخشندہ ستاروں کی روشنی کو گمراہی اور لادینی” کا نام دیا۔

لیکن یہ ..... کارواں چلتا رہا اور .....

تاریخ کا عظیم موڑ برادران۔ ایک قدم آگے بڑھئے اور اپنی تاریخ کے اس عظیم موڑ کو سامنے لائیے جسے ہم ۲۳ مارچ سنہ ۴۰ء کہتے ہیں یہ دن ہمارے لئے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن ہماری اجتماعی آرزوئیں دعا بن کر لبوں پر آئی تھیں۔ ہم نے اپنی منزل کی نشاندہی کی تھی ہم نے مدتوں کے بعد تمکن فی الارض، کا نعرہ لگایا تھا اور پاکستان کے نام سے اپنی جداگانہ مملکت کے حصول کا اعلان کیا تھا۔

ہم نے عہد کیا تھا کہ اس خطۂ زمین کے حصول کے بعد ایک ایسا معاشرہ قائم کریں گے جہاں انسانیت امن و سکون کا سانس لے سکے گی۔ جہاں تمام افرادِ معاشرہ کو نشو و نما کے یکساں مواقع فراہم ہوں گے جہاں "کس نباشد در جہاں محتاجِ کس" کا اصول ایک جیتی جاگتی جنت کی بساط بچھا دے گا۔

سوئے منزل سفر اس منزل کے تعین کے بعد ہم نے اس کے حصول کے لئے سفر شروع کیا جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ

چکا ہوں۔ اگر ہم اپنی قوتوں کو ایک خاص سمت چلنے میں صرف کریں اور ہمارا ہر قدم منزل کی جانب بڑھے تو اسے سفر کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی قوتیں بغیر کسی منزل کو سامنے رکھے صرف میں لائی جائیں تو وقت بھی ضائع ہو گا اور توانائیاں بھی اور جہاں ہیں وہیں رہیں گے یہ سفر بے منزل ہوتا ہے اسے آوارگی کہتے ہیں۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ ایسی حالت میں جب ہم چل رہے ہوتے ہیں، ہمیں معلوم تک نہیں ہوتا کہ کہاں جا رہے ہیں اور جب کہیں جا کر رکتے ہیں تو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں پہنچ گئے ہیں۔

منزل کی مخالفت اس قافلۂ شوق کو جو ۲۳ مارچ ۴۰ء کو آمادۂ سفر ہوا کچھ مخالفتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مخالفت کرنے والے کچھ اپنے تھے کچھ بیگانے۔ اپنے ایسے جنہوں نے بیگانوں سے بڑھ کر دشمنی کا ثبوت دیا۔ غیروں کی مخالفت اپنوں کی دشمنی پر دم بخود ہو کر رہ گئی۔

برادران محترم! اگر اس قافلۂ شوق کی راہ میں مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل روڑے اٹکا رہے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد۔ حسین احمد مدنیؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی بند باندھ رہے تھے۔ اگر غیر ہمیں منزل کی جانب بڑھنے سے روک رہے تھے تو چراغ اپنے گھر کے یہ مقدسین ہم سے منزل کا تصور چھین کر ہمیں بے منزل بنا دینا چاہتے تھے۔ عناد، تعصب۔ غلط نگہی، عدا فریبی اور خود فریبی تقدس کا لباس اوڑھ کر آگے بڑھ آئی تھی۔ یہ حضرات سب کے سب بظاہر اسلامی وضع قطع رکھتے تھے انہیں اپنے علم و دانش پر بے حد ناز تھا۔ لیکن برادران! ان کی نگاہ کی ناخوش اندیشی کا ماتم کیجئے کہ بالآخر ذلت اور شکست کی سیاہی سب کے رخوں پر جلوہ افروز تھی۔

منزل مقصود ملت کے کاروانِ شوق کی کوششیں ثمر بار ہوئیں۔ ذوقِ سفر منزل مراد کو کھینچ کر سامنے لے آیا۔ رہِ منزل نے قدم چومے اور ۱۴ اگست ۴۷ء کو یہ قافلہ منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ یہ مبارک دن ہماری تاریخ کا ایک اور اہم موڑ ہے۔ اس روز ہماری صدیوں کی غلامی کے بندھن ٹوٹ گئے۔ محکومی کا تاریک دور ختم ہو گیا اور آزادی و استقلال کی وہ صبحِ بہار طلوع ہوئی جس کی روشنی میں ہم نے ایک نئی دنیا آباد کرنی تھی۔ وہ دنیا جس میں اطاعت کا مرکز خدا کے قوانین ہوں اور کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کا حق حاصل نہ ہو۔ پاکستان بن گیا اور ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

پاکستان کا حصول مقصود بالذات نہ تھا۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ نصب العین کے حصول کی منزل پر ایک پڑاؤ تھا۔ ہم یہ خطۂ ارض صرف اس لئے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس پر صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہو گی۔ یعنی خالص اللہ کے قوانین رائج ہوں گے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام احکام و قوانین کو ملک بدر ہونا پڑے گا۔ سوچئے کہ ہم نے اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو کیوں؟ یہ ایک چونکا دینے والا احساس ہے۔ اور سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

سالارِ کارواں کے بعد حصولِ پاکستان کے ایک سال بعد سالارِ کارواں ہم سے رخصت ہو گئے اور پھر سے حقیقت خرافات میں کھو گئی۔ حکومتیں یکے بعد دیگرے آئیں اور گئیں۔ کشمکشِ اقتدار کی ایسی ایسی آندھیاں اور طوفان اٹھے کہ منزل کا تصور دھندلا پڑنے لگا۔ اب نئے لیڈر تھے۔ جلسے تھے جلوس تھے، وعدے تھے، تقریریں تھیں سیاسی ہنگامے تھے لیکن۔ ع

نہ منزل تھی نہ منزل کا نشاں تھا

ہماری ملت جن طالع آزماؤں کو غلطی سے لیڈر سمجھے بیٹھی تھی وہ لیڈر رہبر گز نہ تھے۔ انہوں نے اپنی ہوسِ اقتدار اور محلاتی سازشوں سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اور سب کچھ ہیں لیکن ملک و ملت کی خدمت اور راہ نمائی کے اہل قطعاً نہیں۔ انہیں قوم کے راہ نما سمجھنا راہ نمائی کی توہین ہے یہ اقتدار کے لئے بدترین سودے بازیوں پر اتر آئے۔ ان کے گٹھ جوڑ اور سازشوں نے ملک اور ملت کی رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ الغرض ان کی قیادت و سیادت میں فریب خوردہ قوم نے یہ محسوس کیا کہ وہ راہ نماؤں کی قیادت میں سفر نہیں کر رہی بلکہ چند لیڈروں کی ہوسِ اقتدار میں سرِ راہ لٹی جا رہی ہے۔

ملت کا قافلہ اب فریب خوردہ بھی تھا اور گم کردہ منزل بھی۔ اس کا سفر اب سفر نہ تھا بلکہ صحیح معنوں میں آوارگی کا آغاز ہو چکا تھا اور ہم سب اس تاریکی میں کھو گئے تھے۔ نو سال تک ملک کا آئین بھی ترتیب نہ پا سکا۔ سب اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دیتے رہے کہ آئین اسلامی ہوگا۔ لیکن اس کی فوری تدوین بچوں کا کھیل نہیں۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں ایک دستاویز مرتب کر کے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کی مثل پر عمل کرتے ہوئے اسے اسلامی آئین کا نام دے دیا۔

مختلف فرقوں کے علماء نے اعلان کیا کہ آئین اسلامی ہے۔ وہ علماء جو یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں وہ بھلا آئین کو کیا سمجھیں گے۔ قوم کیا چیز ہے۔ قوموں کی امامت کیا ہے۔ اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام۔ ان کے تعصب کی تاریکیاں تاریک تر ہوتی گئیں ان کی نظریاتی آوارگی نے حقیقت کو ان کی نگاہوں سے اوجھل رکھا۔

ملک میں سیاسی اقتدار کی جنگ جاری رہی۔ چاروں طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ حکومتیں صبح و شام بدل رہی تھیں۔ معاشی طور پر ملک دیوالیہ ہو رہا تھا کہ اچانک ایک صبح ہم نے دیکھا کہ عنانِ اقتدار کچھ مختلف ہاتھوں نے سنبھال لی ہے اخباروں نے بتایا کہ ملک میں ایک نئے "انقلاب" نے جنم لیا ہے۔

برادران! ایک ہنگامہ "انقلاب" بنتا ہے یا پھر "ہنگامہ محض" رہتا ہے اس کا فیصلہ ہنگامے کے بعد کے واقعات کیا کرتے ہیں اجازت دیجئے تو عرض کروں کہ انقلاب کہتے کسے ہیں۔ جب ایک نظام بوسیدہ ہو جائے۔ وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے اور اپنی قوتِ رفتار کھو بیٹھے تو ایک نیا نظام آ کر اس کو الٹ دیتا ہے اور اس نئے نظام کی تشکیل ان اقدار پر ہوتی ہے جو وقت کے تقاضوں کا جواب ہوں اور جو نوعِ انسان کو امن و سکون اور ترقی و خوش حالی کا پیام دیں اس تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں تحریک اور شخصیتیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں ہر انقلاب کے ساتھ کوئی نہ کوئی بلند شخصیت وابستہ ہوتی ہے۔ صحیح انقلاب کے خالق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے انداز آفاقی و افلاکی ہوتے ہیں جو چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس رکھتے ہیں۔ جن کے دلوں میں زندگی کی بجلیاں تڑپ رہی ہوتی ہیں۔ جن کے فکر و نظر مستقبل کی دوریوں پر حکیمانہ عبور رکھتے ہیں اور جن کے عزائم ہمالیہ کی طرح صمیم ہوتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالیہ انقلابات ۳۵ سالہ مائیکل افلاک کے ذہن کی کاوشوں کے رہینِ منت ہیں۔ اسی کی زبانی سنئے کہ ایک

انقلاب کی محرک کون سی قوتیں ہوتی ہیں۔ مائیکل اخلاک کہتا ہے "یہ وہ طاقتور نفسیاتی قوتیں ہیں جو انسان کو جد و جہد کے لئے حرکت میں لاتی ہیں" یعنی وہ تبدیلیٔ فکر و نظر ہے جو ہر صاحبِ انقلاب کے دل میں بجلیاں برپا کر دیتی ہے اور اسے اس وقت تک چین نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ان بجلیوں سے باطل کے آشیانے کو راکھ نہ کر ڈالے۔

قرآنی انقلاب | برادران! یاد رکھئے کہ دنیا کا عظیم ترین اور سب سے خوشگوار انقلاب وہ انقلاب ہوگا کہ قرآن حکیم کی مستقل اقدار کی روشنی میں تعمیرِ معاشرہ کو اپنا نصب العین بنائے گا اور برادران وہی فاتحِ زمانہ اور وہی محسنِ انسانیت ہوگا جو اس معاشرے کو متشکل کرے گا۔

برادرانِ میکدہ! میں جانتا ہوں یہی حسین آرزو آپ کے دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہے کس قدر حسین و جمیل اور صاحبِ فکر و نظر ہے وہ ہستی جو اس قسم کے حقیقی انقلاب کی داعی ہے اور جس نے آپ کے اس کاروانِ شوق کو ذوقِ انقلاب کے ولولے عطا کئے ہیں۔

شل خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں!
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا!
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

وہ ہستی جس کی نواہائے سحرگاہی نے خاکسترِ پارینہ سے آتشِ امروز کو زندہ کیا ہے۔ وہ مردِ درویش جو تند و تیز آندھیوں میں اس چراغ کو بحفاظت تمام جلائے ہوئے ہے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اس قابلِ قدر میرِ کارواں کو مخاطب کر کے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ

صفتِ برق چمکتا ہے ترا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

رفقائے سفر! مبارک ہو آپ کو یہ میرِ کارواں۔ اور قابلِ مبارک ہیں آپ کہ

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

۱۹۵۸ء کا انقلاب | برادرانِ محترم! میں اکتوبر ۵۸ء کے انقلاب کا ذکر کر رہا تھا یہ انقلاب ابھی تک وہ انقلاب

نہیں ہو سکا ہے جس کی تعریف میں نے سطور بالا میں کی ہے۔ لیکن بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر ہم اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں کہ کشتی ڈوبنے کے قریب تھی۔ موجوں کی تندی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی کہ موجودہ صدر مملکت نے اسے بچا لیا۔ اگر اس وقت خود غرض اور اقتدار پرست سیاست دانوں کو اقتدار کی مسندوں سے الگ نہ کیا جاتا تو ہمارے مستقبل کی خیر یقیناً نہیں تھی۔ اور پھر یہ اتنا بڑا کارنامہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر معرضِ وجود میں آگیا۔ لیکن ابھی یہ کشتی ساحلِ مراد سے بہت دور ہے۔ ابھی ہم اسے طوفان کی موجوں سے الجھے ہوئے پاتے ہیں۔ یہ حسین آرزو کہ ہماری مملکت میں لا الٰہ الا اللہ کا نظام قائم ہوگا، ابھی پوری ہوتے نظر نہیں آتی لیکن ہم مایوس نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　　یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف مذہبی پیشوائیت اپنی قدامت پرستیوں کی تاریکیاں پھیلانے میں پوری تگ و تاز سے مصروف ہے۔ مذہب کی آڑ میں سیاست کی سٹہ بازی جاری ہے۔ ملوکیت کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔ پیشوائیت کی قبائیں اُسے اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں لیکن آزادیٔ فکر و نظر اور احترامِ انسانیت کا جو آفتاب مشرق کے اُفق سے طلوع ہو رہا ہے اس کی جہاں تاب شعاعوں میں نہ ملوکیت کا استبداد باقی رہے گا نہ پیشوائیت کا مکر و فریب۔

پرانی سیاست گری خوار ہے　　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم　　　تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم!

زمانے کے تقاضے قانونِ مکافات کی دوش پر سوار ہو کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ضمیرِ کائنات میں سے ایک نیا انقلاب ابھر رہا ہے اور اب اسے روکا نہیں جا سکے گا۔

آج صبح کی نشست میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے اپنے مخصوص حسنِ انداز سے علیٰ وجہ البصیرت بتایا تھا کہ مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت آپس میں کیسے کیسے ناپاک گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اس کی زندہ اور بدترین مثال آپ کے سامنے موجود ہے کاش کہ ان دشمنانِ انسانیت کو کوئی علامہ اقبالؒ کا یہ پیغام سنا دے کہ

نفنذ ملت بیضا ہے امامت اس کی　　　جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

دوسری طرف اس کا ردِ عمل یہ ہے کہ ہمیں مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہو کر خالص عقلی اور معاشی بنیادوں پر ایک معاشرہ قائم کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ یعنی اشتراکی نظریات اپنی پُر فریب چمک دمک سے نئی نسل کی نگاہ کو خیرہ کئے ہوئے ہیں۔ ملک میں اس تشتتِ فکر و نظر کو دیکھ کر سرسید علیہ الرحمۃ، حکیم الامت علامہ اقبالؒ و قائدِ اعظمؒ کی روحیں ہر فردِ ملت سے پوچھتی ہیں کہ ؎　　　تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

امید کی کرن!　لیکن برادران! یہ بھٹکا ہوا آہو پھر سوئے حرم آغازِ سفر کر سکتا ہے۔ "گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط" کے مقولہ پر عمل کیجئے۔ اب بھی ہمیں یہ مہلت حاصل ہے کہ اپنی منزل کی طرف رُخ کریں اور مردانہ وار قدم آگے بڑھائیں۔

کتاب اللہ کی روشنی میں عرب کے حدی خوانوں کو عروج و اقبال کی وہ منزلیں عطا ہوئی تھیں جن کی مثال تاریخ میں پھر سامنے نہ آئی۔ رشد و ہدایت کا وہ مینار آج بھی دیدۂ بینا سے اوجھل نہیں ہوا۔ دینِ خداوندی کی منزلِ مقصود صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ خالصتاً قرآن کریم کی عطا فرمودہ مستقل اقدار پر بلا خوف و خطر ایک معاشرہ قائم کریں۔ یہی وہ معاشرہ ہوگا جو کہ بنی نوع انسان کو بے مثال نفع بخشیوں اور عالم آماخوستگواریوں کی ضمانت دے گا۔ اس کی بدولت نوع انسانی پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پالے گی۔ اس کے صدیوں کے دکھ درد ہو جائیں گے۔

یہ تاریخ انسانی کا وہ حیات آفریں انقلاب ہوگا جو عہد رسالتمآب کی سعد ساعتوں کی یاد تازہ کرے گا اور یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ خدا کرے کہ وہ ساعتِ سعید آئے اور جلد آئے۔ اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو پھر یاد رکھئے ۔۔۔ بشیری ہے آئینہ دار نذیری۔ قدرت کے قوانین اٹل ہیں ان کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ آسمان کی آنکھ نے قوموں کے کارواں آتے اور جاتے دیکھے ہیں۔ جب کوئی قوم قانونِ خداوندی سے منہ موڑ لیتی ہے تو اسے سر چھپانے کے لئے کوئی پناہ گاہ تک نہیں ملتی۔ زمانہ اسے اپنی ٹھوکروں سے پامال کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ ذلت اور شکست کے آنسوؤں میں زندگی کے دن پورے کرتی ہے اور مٹ جاتی ہے۔

اگر ہم نے بھی موجودہ راہ سے توبہ اختیار نہ کی تو انجام وہی ہوگا جو دوسری قوموں کا ہوا ؎

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قرآن کا انتباہ بھی یہی ہے کہ

وسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین

خدا ہمیں ایسی عاقبت سے بچائے۔

ضرورتِ رشتہ

میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میرے لئے یہ باعثِ اطمینان و مسرت ہوگا کہ میری عزیزہ بیٹی عمر (پچیس ۲۵ سال) جو میٹرک تک تعلیم حاصل کر چکی ہے اپنے حلقۂ فکر کے کسی موزوں اور تعلیم یافتہ سلیم بیٹے کی شریکِ حیات بن سکے۔ خط و کتابت کیلئے پتہ حسب ذیل ہے۔

ایس۔ ایم۔ فیروز۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام گلبرگ، لاہور

ہمارے

نوجوان طلباء کے مسائل

طلوع اسلام کنونشن میں ہفتہ ۱۳- اپریل، سہ پہر کی نشست مندرجہ بالا موضوع سے متعلق ایک مذاکرہ کے لئے مخصوص تھی۔ اس کی تفصیل آپ کو کنونشن کی روداد میں ملے گی۔ آئندہ صفحات میں وہ تقاریر درج کی جاتی ہیں جو اس مذاکرہ میں ہوئیں۔ ان میں سے ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ جن طلباء، طالبات اور پروفیسر (جنہوں نے) مذاکرہ میں حصہ لیا انہی اپنی تعلیم انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں ہوئی ہے اور ان کے لئے اردو زبان میں اظہارِ خیال ایک مشکل مسئلہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود (دو کے سوا) ان سب نے اردو زبان ہی میں اظہارِ خیال کی ہمت کی ہے جو قابلِ داد ہے۔ تقاریر کے معیار کا اندازہ آپ خود لگا سکیں گے۔

بابِ اوّل

طلبا کی نمایندگی

منیر غضنفر۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

بزرگوں میں عدمِ اعتماد

صاحب صدر اور معزز سامعین۔

یہ بات کہ مغربی تہذیب نے موجودہ نوجوانوں کو نہ صرف مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے بلکہ ان سے اخلاقی قدریں بھی چھین لی ہیں۔ ان کے موجودہ ہیجان اور اخلاقی گراوٹ کا سیدھا سادہ اور آسان جواب ہے۔ جواب ہی میں ایک احتجاج ہے جو ہر گھر، اسکول، مسجد کے ممبر اور سیاسی اسٹیج پہ سے مستقل طور پر نشر کیا جاتا ہے۔ ان نشر گاہوں پر ہمارے بزرگوں کا ایسا ہی راج ہے جیسا حکومت کا ریڈیو اسٹیشنوں پر۔ اور اس بات کا کسے علم نہیں کہ دنیا کی حکومتیں ریڈیو نشریات کو کس حد تک اپنی کمزوریوں پہ پردہ ڈالنے اور اصل واقعات میں ردوبدل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا اجلاس ہم طلبا اور نوجوانوں کے لئے خاص طور پر باعثِ مسرت ہے کیونکہ بات کرنے کا لطف تبھی آتا ہے جب

"کچھ تم بھی سنو، کچھ ہم بھی کہیں"

تاہم یہ بات مدنظر رہے کہ میرا بات کرنے کا انداز بڑوں سے ذرا مختلف ہوگا۔ اس لئے کہ مغربی تعلیم نے اور کچھ نہیں دیا ہے یا نہیں کم از کم مسائل پر تحقیق کرنے کے لئے سائنس کا انداز ضرور دیا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ سائنس یوں ہی اندازے نہیں لگاتی بلکہ اصل واقعات کو سامنے رکھ کر نتائج مرتب کرتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ عموماً رائج شدہ نظریات کے لئے یہ انداز بذاتِ خود موجبِ پریشانی ہوتا ہے۔

معزز حاضرین۔ چونکہ کسی بھی مسئلے کے مکمل تجزیے کے لئے شروع سے آخر تک اس کے ہر جزو کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس لئے میں نوجوانوں کی ذات یعنی (PERSONALITY) اور بزرگوں سے تعلقات کا جائزہ اس دن سے لوں گا جس

دن سے بزرگوں نے ان کی تعلیم کا ذمہ لیا۔

انسان اور حیوان کی زندگی میں ایک فرق شروع سے چلا آتا ہے۔ حیوانی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بن چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی بچہ اپنی ذات میں تمام مضمر صلاحیتیں لے کر آتا ہے لیکن ان صلاحیتوں کی نشوونما اور تکمیل اس دنیا میں ہونی ہوتی ہے تو کیئے اب ان حالات کا جائزہ لیں جو ایک انسانی بچے کو دنیا میں آتے ہی ملتے ہیں۔

بچے کے لئے ماں باپ کی اہمیت جتنی بھی تصور کی جائے کم ہے۔ ماں باپ بچے کی کل کائنات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تمام طبعی ضروریات کے لئے والدین پر انحصار کرتا ہے۔ اور انحصار ہی وہ شے ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ابتدائی عمر میں بچے کا اعتماد والدین پر مکمل اور پختہ ہوتا ہے لیکن افسوس کہ یہ اعتماد بچے کے ساتھ جوان نہیں ہوتا بلکہ بوڑھا اور کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانی شخصیت کی بنیادیں بڑی چھوٹی عمر میں رکھی جاتی ہیں جس تیزی سے بچہ ۵ سال کی عمر سے پیشتر سیکھتا ہے وہ تیزی اس کی آئندہ زندگی میں کبھی نظر نہیں آتی۔ اس کی بننے والی ذات کا انحصار بہت حد تک اس تربیت پر ہوتا ہے جو اسے اس عمر میں ملتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک نوجوان کا موجودہ کردار اس کی بچپن کی تربیت کا ایک اظہار ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ لیکن یہ کہنے سے والدین اپنی ذمہ داری سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔ وہ اس کردار کے ذمہ دار ہیں جس کی بنیادیں ہوش سنبھالنے سے پہلے رکھی گئیں۔

ذمہ داری سے بچنا ایک غلط معاشرے میں عام ہی نہیں بلکہ ہر شخص کا محبوب مشغلہ نظر آتا ہے۔ بچے کی صحیح تربیت والدین کے لئے ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ اسے اندھا دھند پیار تو دے دیتے ہیں لیکن اس کی نفسیاتی کیفیت اور کشمکش کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے لئے وہ چند آسان رستے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ اس کے نفسیاتی تقاضوں کا حل "مار" میں تلاش کرتے ہیں۔ جس مار سے وہ بچے کو ذمہ دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مار بذاتِ خود ان کی غیر ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حکومت حادثات یا جرائم کی روک تھام کے لئے سخت سزائیں تو مقرر کر دے لیکن حادثات یا جرائم کی وجوہات کے متعلق سوچے بھی نہ۔

معزز حاضرین! وہ دن بچے کی زندگی میں بہت اہم ہوتا ہے جس دن اس کے ساتھ پہلا وعدہ توڑا جاتا ہے۔ پھر اسے سمجھانے کے لئے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ اور یہ تو ہر ایک کا تجربہ ہے کہ ایک جھوٹ کو قائم رکھنے کے لئے دس اور جھوٹ ضروری ہو جاتے ہیں ـــــ ظاہراً ان واقعات کا اثر بچے پر کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن دراصل یہ واقعات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

بچہ بہت چھوٹی عمر میں یہ جان لیتا ہے کہ اس کے والدین اُسے ان فعلوں سے روکتے ہیں جو وہ بذاتِ خود کرتے ہیں۔ جھوٹ ہی کو لیجئے ـــــ بچوں پر سچ کی اہمیت ہر ممکن طریقے سے واضح کی جاتی ہے لیکن پھر اپنی بچوں کے

سامنے گھر پر موجود نہ ہونے کے بہانے لگائے جاتے ہیں۔ انہی سے کئے ہوئے وعدے توڑے جاتے ہیں۔ اور انہیں مختلف باتوں سے روکنے کے لئے رشوتیں دی جاتی ہیں۔ بچے اور کہنے کے فرق کو بچے کا سادہ ذہن آسانی سے پہچان لیتا ہے اور وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ یہ دوُرخی روش اس کے والدین اور بزرگوں کے صرف بڑے اور طاقتور ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد بچے کے دل میں بھی جلد بڑا اور طاقتور بننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ بھی اپنے سے کمزور اور چھوٹوں کے ساتھ دوُرخی منافقانہ روش برت سکے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور منافقت کی تعلیم بچے کو بہت شروع سے دی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا تربیت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین بچے کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں اور اس طرح اپنی عزت بھی۔

موجودہ دور میں گھر کے بعد سب سے اہم تربیت گاہ اسکول اور پھر کالج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونہیں تو کم از کم ایک تعلیمی تربیت گاہ کا استاد طرز گفتار اور کردار میں یکساں ہوگا۔ لیکن آپ تعلیم کے شروع سے لے کر آخر تک کسی بھی گوشے کو دیکھئے وہ دوُرخی روش کہیں بھی اوجھل نہ ہوگی۔ وہ استاد جو پابندیٔ وقت کی نصیحت کرتا ہے خود عموماً دیر سے آتا ہے۔ وہ استاد جو کام نہ کرنے پر سزا دیتا ہے یا لعنت و ملامت کرتا ہے خود اپنے پڑھانے کا سبق تیار کر کے نہیں آتا۔

حاضرین! شاید آپ ان مثالوں کو معمولی اور غیر اہم سمجھیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تربیت کے یہی وہ گوشے ہیں جو آخر میں قومی کردار پر غیر محسوس طریقے سے بے حد اثر انداز ہوتے ہیں ـــــ لیکن تعلیم و تربیت کے ابھی کچھ اور بھی گوشے ہیں۔

ہمارے معاشرہ پر ایک نظر ڈالنے سے مسجد کا امام مذہب کا علم بردار نظر آتا ہے۔ یہ وہ امام ہے جس کی زبان سارا دن وعظ کرتے ہوئے تھکتی نہیں۔ لیکن اس کے اپنے کردار کے متعلق کون نہیں جانتا۔ المختصر وہ متضاد خصوصیات کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ جہنم کے خوف کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ مذہب کے متعلق اعتراضی سوال زبان پر ہی نہ آئے۔ لیکن بُرا ہو اس مغربی تعلیم کا جس کے شاگرد پھر بھی سوال کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ مذہب کو بھی بروئے عقل و بصیرت قبول کرنا چاہتے ہیں۔ اب بھلا اس بات کا کیا جواب دیا جائے کہ جس قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس کی ایک آیت کو بکری کیسے نگل گئی۔ (میرا اشارہ آیۂ رجم کی طرف ہے جس کے متعلق روایت میں ہے کہ جس کھونٹے پر وہ آیت لکھی گئی تھی اسے حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی)۔

اس طرح مذہب کے علمبرداروں کا قصور صرف اتنا نہیں کہ وہ نوجوانوں کے بزرگوں میں اعتماد کو ایک اور کاری ضرب پہنچاتے ہیں۔ ان کا مقصود اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ نوجوانوں کو صرف بڑوں سے نہیں۔ اسلام سے بھی بیگانہ کر دیتے ہیں۔

اور نوجوان اس بیگانگی کو زبان سے مانیں یا نہ مانیں، کردار سے ضرور مانتے ہیں۔

حاضرین۔ مذہب کے بابر دو رُخی روش جسے انگریزی میں (HYPOCRACY) کہتے ہیں، کا سب سے بڑا اعلان سیاسی اسٹیج پر کیا جاتا ہے۔ سیاست میں نہ صرف ایسی منافقت کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے بلکہ اسے کامیاب سیاست کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ سیاست دانوں کے وعدے تو ایک ضرب المثل ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ قوم کے موجودہ نام نہاد لیڈر اسلامی نظامِ حکومت کے دعوے کو کسی اعلیٰ مقصد کے طور پر نہیں، اپنی کامیابی کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت تو اسلامی نظامِ حکومت کے مفہوم تک سے ناواقف ہیں۔ کیا یہ کھلی ہوئی منافقت نہیں؟

مقامِ حیرت ہے معزز حاضرین! جن برائیوں کو نئی پود میں دیکھ کر ہمارے بزرگ اس قدر چیختے چلاتے ہیں، وہ انہی برائیوں کو خود بلا جھجک کئے چلے جاتے ہیں۔ خواتین و حضرات! ہمارے معزز بزرگوں کا نوجوانوں کے خلاف صرف اتنا جرم نہیں کہ وہ انہیں جھوٹ بولنے، وعدہ توڑنے اور کام سے جی چرانے کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ وہ انہیں اپنی ذمہ داری دوسروں کے سر تھوپنے کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ایسی ہی بزدلانہ تعلیم دے کر ان میں اخلاقی بلندی نہیں پاتے تو وہ سارا الزام مغربی تعلیم کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

اس تربیت میں صرف والدین ہی نہیں، مدرسہ کے استاد، مسجد کے علماء اور قوم کے نام نہاد لیڈر بھی حصہ دار ہیں۔ ہاں مذہب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے علماء کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔

تاہم معزز حاضرین! اس تمام بیان سے میرا مقصد بزرگوں کو موردِ الزام ہی ٹھہرانا نہیں۔ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اس قسم کی تعلیم کبھی بال و پر شاہین نہیں پیدا کر سکتی۔ کہنے اور کرنے کے درمیان فرق کو ہی منافقت کہا جاتا ہے اور منافقت کی اس تعلیم کے دو ہی نتیجے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ نوجوان بزرگوں میں اعتماد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی عزت کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خود بھی دو رُخی روش اختیار کر لیتے ہیں اور قوم اپنی آیندہ امید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

صاحبِ صدر! جو کچھ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں اسے چند الفاظ میں سمیٹ کر دہرا دوں اور وہ یہ کہ جب بچہ گھر میں آنکھ کھولتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ تمہارے بزرگوار ہیں۔ ان کا ادب اور احترام تم پر لازم ہے۔ لیکن وہ دیکھتا ہے کہ وہ والد بزرگوار جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔

پھر اسے مدرسے میں بھیجا جاتا ہے اور اُسے یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ استاد تمہارے روحانی باپ ہیں۔ ان کی عزت نہایت ضروری ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی یہی دیکھتا ہے کہ وہ واجب الاحترام بزرگ جو کچھ تعلیم دیتے ہیں خود اس کے خلاف کرتے ہیں۔

پھر وہ مسجد میں پہنچتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار انبیائے بنی اسرائیل کے مثیل اور منبرِ رسولؐ کے

وارث ہیں۔ ان کا احترام دین و دنیا میں سعادت عطا کرے گا۔ لیکن وہ دیکھتا ہے ان کی زندگی اس کے یکسر خلاف ہوتی ہے۔ جو کچھ وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر لوگوں سے کہتے ہیں۔

اور پھر جب وہ اور آگے بڑھ کر دنیا کے عملی میدان میں جاتا ہے، تو وہاں سیاسی لیڈر اور ارباب اختیار دکھائی دیتے ہیں جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ قوم کے راہنما اور تمہاری کشتی کے ملاح ہیں۔ وہ دائیں ہاتھ سے چپو چلاتے ہیں اور بائیں سے اس میں چھید کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ ہیں معزز حاضرین ہمارے وہ بزرگ جن کے متعلق نوجوانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف ان کا احترام کریں بلکہ ان پر پورا پورا اعتماد بھی کریں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ میں سے کوئی صاحب بھی اس قسم کے لوگوں پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ اعتماد نہیں کرتے تو پھر آپ ان نوجوانوں کو مورد طعن و تشنیع کیوں ٹھہراتے ہیں۔ قول اور فعل میں تضاد ہی وہ بنیادی مرض ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے چار الفاظ میں کہہ دیا کہ

"لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ"

تم وہ کچھ کیوں کہتے ہو جو کر کے نہیں دکھاتے!

اگر بزرگوں نے نوجوانوں سے احترام کرانا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ وہ کہیں اسے کر کے دکھائیں اس کے بعد دیکھئے کہ یہی سرکش نوجوان کس قدر ادب و احترام کا پیکر بن جاتا ہے۔ نوجوان کا عیب اتنا ہی ہے کہ وہ بڑوں کی طرح منافقت نہیں کرتا کہ دل میں کسی کو گالیاں دے رہے ہیں اور زبان سے اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ وہ جو کچھ دل میں محسوس کرتا ہے اس کا بے دھڑک مظاہرہ کرتا ہے اور بڑے بزرگ اس کو کوستے ہیں کہ وہ ان جیسی منافقانہ روش کیوں نہیں اختیار کرتا۔

مفت

مجرب دوا۔ برائے۔ دمہ۔ درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ :-

حاجی محمد دین۔ شیخ اینڈ سنز

متصل گنیش کمپو پراملز لارنس روڈ کراچی۔

نوٹ :- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

ریحانہ داؤد - گورنمنٹ کالج لاہور۔

اُستاد اور طالب علم کا باہمی رشتہ

محترم صدر اور معزز حاضرین!

اساتذہ اور طلبا کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے مجھے ہر روز ایسے متعدد مواقع ملتے ہیں جب میں ٹیچر اور طالب علم دونوں کے تعلقات کا بغور مطالعہ کر سکتی ہوں۔ لہٰذا میں اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کروں گی کہ اساتذہ اور طلبا کے تعلقات آج جس قسم کے ہیں انہیں آپ کے سامنے پیش کروں۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ تعلیم سے مراد کیا ہے؟ تعلیم سے مراد علم کا مہیا کرنا ہے۔ لیکن کس قسم کا علم۔ کیا علم سے مراد صرف کتابی معلومات فراہم کرنا ہی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایک ٹیچر کا بنیادی فرض اپنے طالب علم کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کرنا ہے۔ ہر طالب علم اپنے اندر بہت سی پوشیدہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ یہ سوچنا کہ ان کی کس طرح سے پرورش کی جائے تاکہ ہر طالب علم وہ کچھ بن سکے اور وہ کچھ کر سکے۔ جو کچھ بننے اور جو کچھ کرنے کی اس میں اہلیت ہے' اساتذہ کا کام ہے۔ یہ جاننے کے لئے کہ ہر طالب علم کی خصوصیتوں کو کس طرز سے اجاگر کیا جائے' صرف چند گھنٹوں کا آمنا سامنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے استاد کو انسانی نفسیات کے اصولوں کو سامنے رکھ کر طالب علم کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ اس کی شخصیت بلند ترین منازل تک بآسانی پہنچ سکے۔ نامکمل اور کھوکھلی نہ رہ جائے۔

والدین بچوں کی جسمانی اعتبار سے پرورش کرتے ہیں۔ انہیں کچھ کھلاتے ہیں۔ پہناتے ہیں اور پھر اسکول یا کالج بھیج کر سمجھتے ہیں کہ اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ لہٰذا جب طالب علم استاد کے پاس آتے ہیں تو ذہنی اعتبار سے ناپختہ ہوتے ہیں کسی قسم کی اخلاقی اقدار ان کے سامنے نہیں ہوتیں۔ اور اگر کچھ اخلاقی اقدار ذہن میں پختہ ہو چکی ہوتی ہیں تو وہ وہی اقدار ہوتی ہیں جو عرصہ دراز سے ہماری قوم کو تباہ و برباد کرتی آ رہی ہیں۔ استاد اگر صحیح اقدار سے واقف ہوتے اور چشم بینا رکھتے ہیں تو ان کے درپیش ایک بڑا ہی نازک اور اہم مسئلہ ہوتا ہے اور وہ مسئلہ طلبا کی شخصیتوں کو سنوار کر انہیں مفید شہری اور نوع انسانیت کے لئے موجب رحمت بنانا ہوتا ہے اس کے لئے ٹیچر کو اپنا تمام وقت تمام کوششیں صرف کرنی پڑیں گی۔ حتیٰ کہ اپنی تمام زندگی وقف کرنی پڑے گی۔ طالب علم اس وقت ہی ٹیچر پر اعتماد کریں گے جب ان کے معاملات میں دلچسپی لی جائے گی۔ اور انہیں اپنے قریب لانے کی جدوجہد کی جائے گی اس طرح ٹیچر کی حیات کا بھی کوئی گوشہ طالبعلم

کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیئے۔ طالب علم کی زندگی ٹیچر کے لئے اور ٹیچر کی طالب علم کے لئے ایک ایسی کتاب کی صورت میں ہونی چاہیئے جس کا ہر ورق دونوں بخوبی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ جب تک ایسا نہ ہوگا باہمی اعتماد پیدا نہ ہو سکے گا۔ دنیا کے سارے قریبی رشتوں میں طلبا اور اساتذہ کا رشتہ سب سے زیادہ نزدیک کا ہے۔ اور اسی اعتبار سے سب سے زیادہ اہم بھی ہے۔ جب تک یہ رشتہ ایک حسین اور خوش گوار قرب کی شکل اختیار نہیں کرے گا، ہمیں یعنی طالب علم طبقے کو کبھی صحیح تعلیم نہیں مل سکے گی۔

طالب علموں اور استادوں کا رشتہ صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن کبھی اتنا پیچیدہ نہیں رہا جتنا آج نظر آتا ہے رسول پاکؐ کے بھی شاگرد تھے لیکن ان کا سلوک اپنے شاگردوں کے ساتھ کس قدر صداقت، محبت، اخوت اور ہمدردی سے لبریز تھا۔ اسی کی بدولت ان کے شاگردوں نے تمام عالم میں علم و ہنر کی جو مشعلیں روشن کی ہیں ان کی روشنی سے آج بھی بہت سے بھٹکے ہوئے راہی منزل مقصود پاتے ہیں۔ ارسطو اور سقراط دو بڑے فلسفی جن کے فلسفے تمام قوموں کی تہذیب و تمدن میں رچے ہوئے ہیں وہ بھی استاد تھے۔ یہ لوگ کتابیں نہیں رٹواتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مقصد تھا، ایک فلسفہ تھا جو وہ اپنے شاگردوں کو سمجھانے اور دکھانے کی کوشش کرتے تھے ان کے پڑھانے کا طریقہ طلباء سے استفسارات کرنا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھی ہمیشہ طالب علم ہی سمجھتے رہے۔ طالب علموں کے درمیان بیٹھ کر گفتگو کے دوران ان سے سوالات پوچھتے تھے۔ ان کے جوابات خندہ پیشانی سے سُن کر پھر اپنے جوابات پیش کرتے تھے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کون استاد ہے اور کون شاگرد!

خیر یہ تو بڑے پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ کچھ پچاس ساٹھ سال پہلے کے زمانے پر ہی نگاہ ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ استاد اور طالب علم ایک ہی جگہ اٹھتے، بیٹھتے، رہتے، سہتے، کھاتے پیتے تھے۔ مسجد ہی مدرسہ تھا۔ جہاں استاد جاتے۔ طالب علم ساتھ جاتے جہاں طالب علم جاتے استاد ساتھ جاتے۔ اس سے اتنا گہرا قلبی تعلق ہو جاتا تھا جیسے کہ عزیز ترین دوستوں کے درمیان ہوا کرتا ہے ہر وقت کے ساتھ رہنے سہنے سے کوئی بات ایک دوسرے سے چھپائی تو جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اس طرح اساتذہ کو طالب علم کی کمزوریوں کو پرکھ کر دور کرنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن اساتذہ کو اپنی کمزوریاں چھپانے کا موقع بالکل نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ طلباء جو ساتھ لگے لگے پھرتے تھے اپنا غلطی کرنے کو جی بھی چاہتا تھا تو دل پر جبر کر جاتے تھے اور اپنے کردار کو اپنے طالب علموں کے لئے مثال کے طور پر پیش کرتے تھے۔ طالب علم ان کی تقلید کرتے تھے۔ کیونکہ کم عمری کے زمانے میں طبیعت اثر بہت جلد قبول کر لیتی ہے یوں دونوں کے کردار اور اخلاق میں بھی بہت مشابہت آجاتی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ دیکھ کر ہی بتا دیتے تھے کہ فلاں لڑکا فلاں کا شاگرد ہے۔ اخلاق کچھ اتنے پختہ ہو جاتے تھے کہ ساری عمر انہی کی حدود میں گزر جاتی تھی۔ بقول علامہ اقبالؒ کہ ؂

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے!!

آیئے اب ذرا اس دور کے مقصدِ تعلیم پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ لڑکے کے ذہن میں بچپن سے ہی یہ بٹھا دیا جاتا تھا کہ تعلیم حاصل کرنا اور ڈگری لینا ایک ذریعہ ہے نوکری حاصل کرنے کا۔ لہٰذا نوکری یا ملازمت حاصل کرنا ہی وہ مقصدِ اولین قرار دیا جاتا ہے جس کے حصول کی خاطر علم حاصل کیا جائے۔ گورنمنٹ اور یونیورسٹی نے اس قسم کی پابندیاں لگا دی ہیں کہ بغیر لکھے پڑھے کوئی ملازمت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ تعلیم جو حاصل کی جاتی ہے اس میں شوق یا دلچسپی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بڑوں نے نوجوانوں کے لئے علم جیسی بلند شے کو روٹی کمانے کا ایک ذریعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

لڑکیاں چونکہ ملازمت نہیں کرتیں اس لئے بڑے بوڑھے انہیں اس لئے تعلیم دلاتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے دولت مند گھرانے سے رشتہ آنے کے زیادہ امکان ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو خود یہ علم ہوتا ہے کہ انہیں تعلیم کس غرض کیلئے دلوا جا رہی ہے اس لئے وہ جانتی ہیں کہ شادی کے بعد یہ تعلیم ان کے کسی کام آئے گی ہی نہیں۔ جب یہ تصور ذہن میں بیٹھا ہو تو علم سے لگاؤ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

جب علم حاصل کرنے کا کوئی واضح مقصد سامنے نہیں ہوتا تو پھر ظاہر ہے کہ طلبا کا ذہن ہر سمت کو جاتا ہے سوائے علم کے۔ اساتذہ نے حرف کو اس مقررہ وقت میں ختم کروانا ہوتا ہے۔ گھنٹا بجتا ہے۔ ٹیچر کلاس میں آتی ہے۔ گھنٹے بھر تک لیکچر دے کر باہر چلی جاتی ہے۔ اور جماعت سے نکلتے ہی طالب علموں سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ حال ہی کی مثال ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تمام یونیورسٹیوں کے شعبے میں ایک سرکیولر بھیجا جس میں یہ اصول درج تھا کہ اگر یونیورسٹی کیمپس میں کوئی لڑکی ایک بجے کے بعد نظر آئی تو اس کی ذمہ داری ہم نہیں لے سکتے۔ اساتذہ کی ذہنیت کا نادر نمونہ یہ سرکیولر ہے جو وضاحت طلب نہیں!۔

کتابی معلومات فراہم کرنے کے لئے بھی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پڑھانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اکثر ٹیچرز کو اپنے مضمون پر مکمل عبور ہی نہیں ہوتا ایک تو لیکچر ہی بڑا غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ دوسرے طالب علموں کے ذہنوں میں ہزاروں سوالات اٹھتے ہیں جن کا کوئی تسلی بخش جواب انہیں کبھی نہیں ملتا۔ ٹیچر سوالات کے جواب دینے کے بجائے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ کوشش طلبا سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔ جب دماغ میں سوالات کانٹوں کی مانند چبھنے لگتے ہیں اور ٹیچر بدستور تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتی ہے تو دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلیم سے کیا فائدہ؟

یہ آج کل جتنی بھی ہڑتالیں وغیرہ ہو رہی ہیں ان پر گہری نظر ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان سب میں ان نوجوانانِ وطن کی بے قرار و مضطرب روح کچھ چاہ رہی ہے آپ سے کچھ مانگ رہی ہے کیا آپ نے کبھی ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھا ہے کہ یہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ اور ان کے تقاضے کیا ہیں؟ اگر نہیں دیکھا تو برا کیا۔ اب بھی وقت ہے دیکھنے کی کوشش کیجئے جب بھی کوئی اسٹرائیک ہوتی ہے طالب علموں کو دنیا بھر کے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ سب سے بڑھیا اور عمدہ خطابات ہمیں اساتذہ کی طرف سے ہی ملتے ہیں۔ ہم نکمے ہیں سست ہیں۔ احسان فراموش ہیں (ingrates) ہیں لیکن معاف فرمائیے کیا ہم اپنے بزرگوں اور اساتذہ سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ طلبا کے سامنے نمونہ کس قسم کا پیش کرتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ جیسے ہمارے اور ہمارے تمام سوالات رد کر دئے جاتے ہیں یہ سوال بھی رد کر دیا جائے گا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم سوچنے سمجھنے کی کوشش ہی

نہیں کرتے۔ ہمیں سوچنے سمجھنے دیا ہی کب جاتا ہے؟ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں اپنی زندگی کارآمد اور مفید بنانا چاہتے ہیں لیکن اس باب میں تعلیم ہماری کچھ بھی مدد نہیں کرتی نہ ہی اساتذہ کوئی راہ نمائی کرتے ہیں۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں جو طلبا ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں ان کے سامنے زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں ہوتا انہیں کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیوں جی رہے ہیں۔ ان کے دماغ پر پریشانی اور ناامیدی کا غبار چھایا ہوتا ہے۔ افسوس کوئی بھی کسی کو کسی طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

جب طالب علموں کو بلاسبب برا بھلا کہا جاتا ہے۔ ان پر بازاری فقرے چست کئے جاتے ہیں تو کیا آپ کا خیال ہے وہ خوش ہوتے ہیں؟ نہیں۔ اس کے بالکل برعکس ان کے سینوں میں انتقام کی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اسی انتقامی جذبہ کے تحت وہ اسٹرائکیں کرتے ہیں ان اسٹرائکوں کو آپ غنڈہ گردی سے تعبیر کرتے ہیں تو کیا کیجئے! لیکن کیا کبھی آپ نے ان کے مطالبات پر بھی غور کیا ہے۔ ان کی الجھنیں سلجھانے کی کوشش کی ہے اگر اساتذہ نے ایسا نہیں کیا تو انہوں نے اپنا بھی وقت برباد کیا ہے اور طلبار کا بھی۔ جب ہر طریقہ سے نوجوانوں کی خودداری پاؤں تلے کچل دی جاتی ہے۔ تو پھر ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ بڑوں کی عزت کریں! فرماں بردار بنیں! پڑھائی کی طرف توجہ دیں۔

فرض کیجئے ایک کالج میں مستقل کھانا خراب مل رہا ہے۔ طلبا نے بہت کہنے سننے کی جدوجہد کی ان سے وعدے کئے گئے کہ کھانا بہتر پکے گا یہ واضح ہے کہ طلبا بڑھیا کھانا نہیں چاہتے صرف یہ چاہتے ہیں کہ پکوایا اچھی طرح جائے۔ کوئی ان کی شکایت پر دھیان نہیں دیتا۔ کافی عرصہ گزر جاتا ہے آخر کار ایک دن وہ بھوک ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اساتذہ کو سخت غصہ آتا ہے۔ تعلیم یافتہ طالب علموں کی غیر شریفانہ حرکات پر انہیں بہت ڈانٹا ڈپٹا جاتا ہے لیکن بے سود! کہا یہ جاتا ہے کہ امیر گھرانوں سے آکر چاہتے ہیں کہ روز پلاؤ زردہ ملے۔ یہ محض تہمت ہے۔ وہ ایسا کچھ نہیں چاہتے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ سپروائزر (SUPERVISORS) باورچیوں سے کھانا اچھی طرح سے پکوائیں۔ کیا بھوکے رہنے سے انہیں لذت حاصل ہوتی ہے؟ اساتذہ شاید یہی سمجھتے ہیں۔

بے توجہی کا شکار ہمارے یہ نوجوان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اکثریت اس گروہ کی ہے جو مغرب زدہ یا (TEDDIES) کہلاتے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ وہ ہر وقت ہشاش بشاش خوش و خرم رہتے ہیں۔ کوئی غم انہیں چھو کر نہیں گزرتا۔ چست لباس زیب تن کئے یہ تمام دن (CHA CHA CHA) اور (TWIST) کے ریکارڈ سنتے رہتے ہیں۔ ناچتے گاتے رہتے ہیں۔ لیکن یہی شوخ اور چنچل طالب علم جب رات کی خاموشی میں تنہا اپنے کمروں میں جاتے ہیں تو انہیں خود اپنی ہستی سے خوف آنے لگتا ہے۔ دن بھر وہ جو کچھ کرتے رہے انہیں وہ بے معنی سا نظر آتا ہے۔ انہیں کچھ اور کرنا چاہیئے۔ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے تبدیلی ہونی چاہیئے یہ وہ جانتے ہیں لیکن اور کیا ہونا چاہیئے؟ کیسی تبدیلی ہونی چاہیئے؟ یہ وہ نہیں جانتے! نہ کوئی مولوی اس مسئلہ کو حل کرتا ہے نہ کوئی ٹیچر انہیں صحیح راہ دکھاتا ہے اپنی بے بسی اور لاچاری کے احساس کے تحت ان کی ویران آنکھوں میں آنسوؤں کے دیئے جھلملانے لگتے ہیں۔ یہ آنسوؤں کے دیئے بزرگوں اور اساتذہ

کے ظلم اور زیادتی کی نشان دہی کر رہے ہوتے ہیں وہ گھٹی گھٹی سی آہیں بھر کے رہ جاتے ہیں۔ کون بیوقوف کہہ سکتا ہے کہ یہ دکھیارے غریب طالب علم بے فکرے ہیں؟ ان کے قہقہے، ان کی ہنسی سب ایک مسلسل فریب ہے جو وہ اپنے آپ کو دیتے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں اس فریب میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ یقیناً اساتذہ پر۔

طالب علموں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو ہمیشہ مغموم اور رنجیدہ رہتا ہے۔ مقابلتاً انہیں شریف طالب علم کہا جاتا ہے یہ مغرب زدہ نہیں کہلاتے۔ اور نماز روزے کے پابند رہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سکون انہیں بھی نہیں ملتا۔ ہر چیز سے نالاں! اپنے ہی تصورات کی پیچ دار گھاٹیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس گروہ کی روش ان کے حق میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلے گروہ کے طالب علم تو کسی طرح اپنے آپ کو فریب دے کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ دل کے جذبات دل ہی میں دبائے رکھتے ہیں۔ یہ قنوطیوں کا گروہ ہے۔

میں نے اس وقت آپ سے صرف ان ٹیچرز کا تذکرہ کیا ہے جو طلبا سے بے تعلق رہتے ہیں۔ ایک طبقہ ان ٹیچرز کا بھی ہے جو بظاہر طلبا سے بہت گھل مل کر رہتے ہیں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ان کی بہت مشفق دوست اور ہمدرد رفیق ہیں لیکن بغور دیکھنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ ان کے سامنے ایک اور مقصد ہے اور وہ یہ کہ وہ طلبا کے ذہنوں پر اپنے نظریات زندگی مسلط کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں اور رفاقتیں ان کے اس مقصد کے حصول کا مقدس ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ئیوٹرز پہلی قسم کی ٹیچرز سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

ہمیشہ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ ایک طرف اساتذہ طلبا کی برائیاں کرتے ہیں اور دوسری طرف طلبا اساتذہ کی برائیاں کرتے ہیں۔ یہ عیب جوئی کی عادت پہلے صرف اساتذہ ہی کو تھی۔ طلبا نے کچھ دیکھا دیکھی کچھ انتقاماً اپنالی۔ میں نے تو اکثر طالبعلموں کو یہ کہتے سنا ہے کہ مس فلاں سے تو اچھا ہم خود پڑھا سکتے ہیں۔ فلاں کو تو بالکل پڑھانا آتا ہی نہیں۔ جب طالب علموں کو خود یہ علم ہو کہ اساتذہ کو کچھ نہیں آتا تو وہ پھر ان سے کس دل سے پڑھیں گے لہٰذا وہ لیکچر سننے کی بوریت سے بچنے کے لئے جماعت ہی سے غیر حاضر رہتے ہیں جس پر انہیں لاپرواہ اور احسان فراموش ضرور کہہ دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی چکنے گھڑے بنے رہتے ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے لئے معمہ بن گئے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بجائے دوستی کے دشمنی کے جذبات رکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جماعت میں ٹیچر بھی اور طالب علم بھی دل پر پتھر رکھ کر جمع ہوتے ہیں اور گھنٹی کی آواز پر دونوں چین کا سانس لیتے ہیں اس مختصر عرصے میں بھی دونوں فریق ایک دوسرے کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں۔

سب اساتذہ یوں بے پروا اور برے ہی نہیں ہوتے۔ کہیں سو میں سے ایک آدھ ایسا بھی ہوتا ہے جو تعلیم کے صحیح مفہوم سے واقف ہو۔ اور یہ دیکھا گیا ہے کہ جو استاد ذرا بھی طلبا کے معاملات میں دلچسپی لے اور پڑھانا جانتا ہو ہمیشہ

طلبا اس کے تمام شاگرد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ طلباء دن رات کسی ہمدرد کے قرب کی خاطر ترستے تڑپتے رہتے ہیں جو انہیں ان کا صحیح مقام دے سکے۔ اور انہیں سمجھ سکے ایسا شخص مل جائے تو وہ جماعت میں اونگھتے ہیں نہ جماعت سے غیر حاضر رہتے ہیں بلکہ دل لگا کر اس مضمون پر محنت کرتے ہیں۔

ایک مشفق استاد کی اہمیت کس قدر ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہالینڈ کے ایک مستشرق نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔

(MODERN MUSLIM KORAN INTERPRETATION BY J. M. S. BALJON)

اس میں اس نے پرویز صاحب کی قرآنی فکر کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اسے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ وہ ان کی ان کوششوں کی بڑی تعریف کرتا ہے لیکن پرویز صاحب کی جو خدمت اس کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے وہ کچھ اور ہے اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ

"پرویز صاحب کی یہی خوبی نہیں کہ انہوں نے قرآنی حقائق کو اس حسن و خوبی سے نہایت ادیبانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کے استاد ہیں۔ اور ان نوجوانوں کے لئے جو راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور جن کی زندگی کی کشتی کے لئے مذہبی لنگر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مشفق دوست (PATERNAL FRIEND) ہیں"

ایک استاد کی سب سے بڑی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ اپنے طلبا کا باپ سے بھی زیادہ مشفق دوست ہو۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایسے اساتذہ عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر چند استاد بھی اس ڈھب کے مل جائیں تو ان نوجوان طالب علموں کی ذہانت اور ان کی صلاحیتوں کا رُخ تعمیری مقاصد کی طرف موڑ کر قوم کی سب سے بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں! — شکریہ۔

[تقریر کے بعد محترمہ مقررہ نے کہا کہ جس طرح (BALJON) نے پرویز صاحب کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنی کتاب لکھی ہے، میں بھی اپنے اس مشفق استاد سے (جو میرے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں) اسی طرح متاثر ہوں۔ اس تاثر کا نتیجہ، بلا ساختہ ایک انگریزی نظم کی صورت اختیار کر گیا جسے میں پیش خدمت کرتی ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی وہ نظم سنائی۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے!　　(اقبالؔ)

جاوید رحیم۔ انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور

طلبا کی معاشی مشکلات اور اُن کا حل

معزز خواتین و حضرات! اسلام علیکم۔

ہمارے معاشرے کی طرح طلبا کو بھی تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ طلبا ہیں جن کا تعلق اونچے یا امرا کے طبقے سے ہے۔ ان کے بعد متوسط طبقے اور پھر نچلے طبقے کے طلبا آتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ میں اپنے اس مضمون میں صرف متوسط اور نچلے طبقہ کے طلبا کی معاشی مشکلات سے بحث کروں گا۔ کیونکہ معاشی مشکلات تو صرف انہیں کو پیش آتی ہیں یہ بھی واضح رہے کہ اس مضمون میں ان بدقسمت لڑکے اور لڑکیوں کا ذکر نہیں کیا گیا جو باوجود اچھی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے محض غربت کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ میرا موضوع ہے طلبا کی معاشی مشکلات۔

ان طلبا کی معاشی مشکلات کو دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور تو ان کی تعلیم کا زمانہ ہے اور دوسرا دور ان کی تعلیم کے فوری بعد کا زمانہ، جب انہیں فکرِ معاش دامنگیر ہوتی ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد لوگوں میں تعلیم کا عام چرچا ہوا۔ کہیں تو وہ زمانہ تھا جب کسی مسلمان لڑکے کا میٹرک پاس کر لینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا اور کالج کا منہ دیکھنا کم ہی کو نصیب ہوتا تھا۔ اور پھر وہ زمانہ آیا کہ تقسیم کے دو یا تین برس بعد ہی ہندوؤں اور سکھوں کی اس قدر کثیر تعداد کے چلے جانے کے بعد بھی موجودہ تعلیمی اداروں کو ناکافی سمجھا گیا۔ حالانکہ ان میں بیشتر تعداد ان درسگاہوں کی تھی جنہیں ہندو اور سکھ یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لہٰذا نئے نئے اسکول اور کالجوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن طلبا کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اور اب حالت یہ ہو گئی کہ اس وقت پندرہ یا سولہ برس پہلے کے مقابلے میں دُگنے اور تگنے طلبا موجود ہیں۔ حصولِ تعلیم کی اس دوڑ میں ہر طبقے کے طلبا موجود ہیں۔ جب کہ پہلے کالج کی

تعلیم صرف اونچے طبقہ یا زیادہ سے زیادہ متوسط طبقے کے طلبا ہی حاصل کرتے تھے یہ تبدیلی بہت خوش آئند ہے اور اپنی جگہ پر خوشگوار نتائج کی حامل۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کئی ایسے مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کا تعلق بنیادی طور پر ہمارے ناقص معاشی نظام سے ہے۔ ان مسائل کی نوعیت کیا ہے اور ان سے کون سے تباہ کن نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ یہی وہ امور ہیں جن کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

کالج کی ایک ایسی نمائندہ کلاس کی مثال لیجئے جس میں ہر طبقے کے طلبا پڑھتے ہیں۔ کالج کی کلاس کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس عمر میں طلبا نسبتاً زیادہ پختہ ذہن کے ہوتے ہیں اور ان میں اپنے ماحول اور گرد و پیش کا شعوری طور پر احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ ان کی ذات کے واضح خدوخال بھی یہیں ابھرتے ہیں اور پھر معاشی دشواریاں بھی کالج کی مہنگی تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں زیادہ در پیش آتی ہیں۔

اس کلاس میں بڑے بڑے مل مالکوں اور زمینداروں کے بیٹے بھی پڑھتے ہیں اور غریب دہقانوں اور محنت کشوں کے بیٹے بھی پڑھتے ہیں جو محض اپنی دماغی صلاحیتوں اور تعلیم کے شوق کی وجہ سے اس قابل ہوئے ہیں کہ اونچے طبقے کے ان طلبار کے شانہ بشانہ بیٹھ سکیں۔ اس کلاس کو ایک نظر سے دیکھنے سے شاید یہ احساس ہو کہ مساوات اور اخوت کا اس سے بہتر نظارہ اور کہاں دیکھنے میں آ سکتا ہے جس میں ایک مزدور کے بیٹے کو ایک مل مالک کے بیٹے کے ساتھ ایک ہی حیثیت میں بیٹھنے کا اتفاق ہو لیکن حقیقت اس سے کچھ اور ہے۔

مل مالک یا زمیندار کا بیٹا کار میں بیٹھ کر آتا ہے اور ہر روز نت نئے سوٹ تبدیل کرتا ہے اسے ہر قسم کے عیش و آرام میسر ہیں۔ اس کے باپ کی دولت اس کے مستقبل کی ضامن ہے۔ کالج میں اس کا آنا تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اونچی سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا زیادہ وقت کلاس روم میں نہیں بلکہ ٹک شاپ میں گزرتا ہے۔ اپنے ان ہم جماعتوں کے ساتھ جن کا تعلق بدقسمتی سے نچلے طبقہ سے ہوتا ہے وہ بات تک کرنا گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی دانست میں انہیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اور وہ گنوار اور اجڈ ہوتے ہیں۔ اس کے اس حقارت آمیز رویہ اور نفرت انگیز برتاؤ سے۔ نچلے طبقے کے ان طلبار کی اندرونی کیفیات کیا ہوتی ہیں اس کا احساس ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں اگر ہم کسی مزدور یا دہقان کے بیٹے کی کٹھن زندگی پر غور کریں۔

اس مزدور یا دہقان کے بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے کی لگن ہے۔ پرائمری سے لے کر کالج تک وہ اپنی خداداد ذہنی صلاحیتوں کی بدولت وظائف حاصل کرتا رہا ہے اور اس طرح اسکول کے زمانے تک وہ کسی حد تک اپنے تعلیمی اخراجات کو خود اٹھائے رہا۔ قصباتی یا مضافاتی اسکول میں طبقات کی تقسیم اتنی شدید نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر وہ معمولی لباس پہن کر بھی اپنے آپ کو اتنا کمتر محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود اسے اس زمانے میں بھی نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اپنے تعلیمی اخراجات میں تو وہ کسی حد تک خود کفیل ہوتا ہے لیکن اس غریب خاندان پر یہ بوجھ کیا کم ہے کہ وہ

خاندان اپنے ایک کمانے والے فرد سے محروم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔ لیکن اس ذہین بچے کا درخشندہ مستقبل جو سب کو نظر آرہا ہوتا ہے اس مخالفت پر غالب آجاتا ہے۔ میٹرک میں شاندار کامیابی اور وظیفہ حاصل کرنے کی بدولت وہ کالج میں داخلہ لیتا ہے۔ یہاں کا ماحول وہ یکسر مختلف پاتا ہے۔ امیر طلباء اسے بار بار اس کی غربت کا احساس دلاتے ہیں۔ قدم قدم پر اس کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اس کے سینے میں اپنی اس حالت کی وجہ سے شدید قسم کا احساس کمتری پرورش پانا شروع کر دیتا ہے۔ جس سے اس کی ذات کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ وہ، وہ کچھ نہیں بن پاتا۔ جو کچھ بننے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ اس کی تعلیمی ترقی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اکثر حالات میں وہ اپنا پچھلا شاندار ریکارڈ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ اس نے کالج میں اپنی تعلیم کو کامیابی سے مکمل کر لیا ہے تو اس سے اگلا مسئلہ فکر معاش کا ہے۔ تعلیم کے دوران اس نے اپنے گرد حسین آرزوں اور تمناؤں کا ایک جال سا بن لیا ہوتا ہے اور ان کے پورا ہونے کا یہی وقت ہوتا ہے۔ اس امید پر کہ ڈگری حاصل کر چکنے کے بعد وہ اس قابل ہو سکے گا کہ اپنی غربت اور افلاس کا علاج کر سکے اور اس طرح معاشرہ میں کوئی مقام پیدا کرے۔ اُسے اس دور میں ان ان گنت مشکلات پر قابو پانے کی ہمت دی ہوتی ہے۔ لیکن عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اس کے ان حسین خوابوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ معاشرہ اس کو اس کی غربت اور افلاس کی وجہ سے اب بھی معاف نہیں کرتا۔ اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے اس پر بند ہیں کیونکہ اس کا تعلق کسی اچھے خاندان سے نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کے رشتہ دار کسی ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے ہیں جو اس کی اس مشکل میں کام آسکیں۔ یہ اس کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اگر اسے سوڈیڑھ سو روپے کی کلرکی مل جائے۔ یہ ہے اس کی اس عام جدوجہد کا انجام۔

اس کے اس حسرت ناک انجام سے صرف یہی نہیں ہوا کہ اس کی زندگی تباہ ہو گئی بلکہ معاشرہ اپنے ایک ایسے ہونہار فرد سے محروم ہو گیا جس سے تعمیری کام لیا جا سکتا تھا۔ ہم اس کا احساس کر سکتے ہیں کہ معاشرے کی اس بے انصافی کا ردِ عمل اس پر کس قسم کا ہو سکتا ہے؟ یا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جائے گا اور اس طرح اس کی صلاحیتیں ہمیشہ کے لئے دب کر رہ جائیں گی اور یا اس میں حسد۔ نفرت اور انتقام جیسے منفی جذبات پرورش پانا شروع کر دیں گے۔ اور اس طرح وہ معاشرے کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ کیونکہ یہ جذبات اُسے ہر اس سمت میں لے جا سکتے ہیں جس کا مقصد تخریب ہو۔ یہی وہ نفسیاتی کشمکش ہے جس سے افراد کو نجات دلانا معاشرے کا فرض ہے۔

متوسط طبقے کے طلباء کی حالت کسی حد تک مضحکہ خیز بھی ہے اور قابلِ رحم بھی۔ قدرتی طور پر انہیں نچلے طبقے کے طلباء جیسی معاشی دشواریاں تو پیش نہیں آتیں۔ لیکن ان کے والدین کی آمدنی کا نازک توازن ایک مسلسل عذاب ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ ان کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنی پوزیشن رکھی جائے تاکہ اونچے طبقے کے طلباء سے

رہ ورسم بڑھائے جاسکیں۔ اور ان تمام نگاہ فریب مناظر کی ایک جھلک دیکھ لی جائے جن سے اول الذکر طلباء مستفید ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں کئی طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کبھی تو وہ خوشامدانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت ان امیر طلباء کے مصاحبوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اور کبھی وہ بناوٹ سے کام لیتے ہیں اس منافقانہ رویے کی وجہ سے ان کی خودی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اتنا کچھ قربان کرنے کے باوجود انہیں وہ کچھ حاصل نہیں ہوتا جس کی انہیں آرزو ہوتی ہے اور اس طرح مایوسی اور ناکامی کا شکار ہو کر اپنے اندر احساس کمتری پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی کشمکش میں تعلیم مکمل کی جاتی ہے اور پھر کسی نوکری وغیرہ کی تلاش کی جاتی ہے۔ جتنا عرصہ تک وہ خود کفیل نہیں ہو جاتے ان کا وجود اپنے خاندان کے لئے باربنا رہتا ہے۔ والدین بھی اپنی جگہ حق بجانب ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی ساری توقعات انہی سے وابستہ کی ہوتی ہیں۔

ان حالات میں تعلیم مقصود بالذات نہیں بلکہ صرف معاش حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ معاشی مسائل ہیں جنہوں نے طلباء کو پچھلے برس تعلیمی کمیشن کی اصلاحات کے خلاف اکسانے پر مجبور کیا۔ ورنہ ان اصلاحات کی تعلیمی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔؟

معاشرے میں جب مختلف طبقات کی حالتوں کا موازنہ کیا جاتا ہے تو لازمی طور پر بہت سے تلخ حقائق سامنے آ گئے ہیں بدقسمتی سے ہمارے ہاں اب یہ سمجھا جا رہا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور دوسری ناہمواریاں صرف کسی اشتراکی کو ہی نظر آسکتی ہیں۔ ورنہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ طبقاتی تقسیم بالکل قدرتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا ہو میں صاف الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن ایسی طبقاتی تقسیم کو جائز قرار نہیں دیتا۔ پرویز صاحب کے الفاظ میں :-

> قرآن پیدائشی تفریق کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ ہر فردِ آدم کو فرزندِ آدم تصور کر کے سب کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے تاکہ ہر ایک کی مضمر صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پا سکیں۔
> لیکن یہ صرف اسی معاشرے میں ممکن ہے جس میں نظام ربوبیت رائج ہو۔
>
> (نظامِ ربوبیت صفحہ ۱۳۶)

نظامِ ربوبیت افراد کی تعلیم و تربیت معاشرے کا اجتماعی فرض قرار دیتا ہے کیونکہ اس قدر اہم کام جس پر قوم کے مستقبل کا دارومدار ہو افراد کے ذمے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ لیکن اس نظام کا قیام اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے اگر ہمیں قرآن کے قوانین پر یقین ہو۔ یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ وہ افراد کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر کے ایک بالکل نئے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔

اس کے بعد یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک ایسے معاشرے کا قیام عمل میں آ گیا جس میں ہر فرد کو معاشی ضمانت حاصل ہو تو کیا طلباء تعلیم کے حصول میں وہی بے اعتنائی نہیں برتیں گے جو آج کل اونچے طبقے کے طلباء کا خاصہ ہے۔

اس کے بعد یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک ایسے معاشرہ کا قیام عمل میں آگیا جس میں ہر فرد کو معاشی ضمانت حاصل ہو تو کیا طلبا تعلیم کے حصول میں وہی بے اعتنائی نہیں برتیں گے جو آج کل ادنیٰ طبقے کے طلبا کا خاصہ ہے۔

اس کا جواب چند الفاظ میں اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ قرآنی نظام ربوبیت میں ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ موجودہ حالات میں یہ بے راہ روی صرف اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ان طلبا کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین نہیں ہوتا۔ قرآنی نظام ربوبیت میں نوجوانوں کی تربیت ہی اس انداز سے کی جائے گی کہ زندگی کے بلند اقدار کی اہمیت ان پر اس طرح واضح ہو جائے کہ وہ اپنی عملی زندگی کو قرآنی سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائیں اس سے اس عجیب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایسے نظام کے قیام کے لئے ضروری نہیں کہ خون کی ندیاں بہا دی جائیں۔ جیسا کہ مختلف اشتراکی ممالک میں ہوا ہے۔ جہاں اس سلسلے کشت خون کا مقصد "روٹی کا مسئلہ" حل کرنا تھا۔ اور اس کے لئے ان تمام بلند اقدار کو نظر انداز کر دیا گیا جن سے انسانی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ قرآن افراد میں اندرونی تبدیلی لا کر خارجی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کرتا ہے جس سے نہ صرف روٹی کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے بلکہ وہ تمام مسائل بھی سلجھ جاتے ہیں جن کا تعلق انسانی ذات سے ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں!

اور شرف انسانیت اسے پکار پکار کر کہتا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

سلیم کے نام خطوط

جس میں ان تمام سوالات کا نہایت مدلل۔ اطمینان بخش اور بصیرت افروز جواب دیا گیا ہے جو ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انداز بیان نہایت شگفتہ اور دل نشین ہے۔ یہ خطوط نہیں بلکہ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔

قیمت جلد اول ۸ روپے جلد دوم ۶ روپے۔ جلد سوم ۶ روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

نسیم عالم زیب۔ کینرڈ کالج لاہور۔

طلباء اور پاکستان

(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

ایک طالب علم کی حیثیت سے، ابھی ابھی ابھرنے والی نسل کے تاثرات کے بارے میں بڑی حساس واقع ہوئی ہوں ــــ اس سے میری مراد ہمارے طلبا ہیں ــــ یہ تاثرات ہماری امیدوں اور امنگوں کے لئے حوصلہ افزا نہیں بلکہ اس کے برعکس خود پاکستان کے مستقبل کے لئے بیحد مایوس کن اور تشویش انگیز ثابت ہو رہے ہیں۔ ان تاثرات کا سرچشمہ بے یقینی کی وہ کیفیت ہے جو خود اس ملک کے قیام اور اس کی وجۂ جواز کے متعلق ان کے دلوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ اور بالآخر اس سے خود ان کی ذات بھی اثر پذیر ہوتی ہے۔

ابھرتے ہوئے سوالات

ہر شخص اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ اس قسم کے شبہات اور بے یقینی اور تو اور خود طالبعلم کی تعلیمی سعی و کاوش میں منفی اور تخریبی رجحان پیدا کئے رکھتی ہے۔ "میں کیوں مطالعہ میں سرگرم رہوں؟ ــــ کیوں سعی و کاوش سے کام لوں؟" اس کے ذہن میں یہی سوالات نہیں ابھرتے بلکہ یہ اندیشہ بھی اسے پریشان کر سکتا ہے کہ آیا تقسیم ہند باقی بھی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ سوچئے کہ کاروبار حیات میں جب کوئی ٹھوس نصب العین سامنے نہ ہو تو ذوق عمل کے لئے تحریک کیا ہوگی؟

آپ نے غور فرمایا کہ ایک طالب علم کن سوالات سے دوچار ہوتا ہے؟

تحریک پاکستان کی اصل و اساس کیا ہے؟

ہندو اور مسلمان بعینہٖ اسی طرح مل جل کر کیوں نہیں رہ سکتے تھے جس طرح دیگر ممالک کے مختلف مذہبی عناصر رہتے ہیں؟

اس برصغیر کی تقسیم کیوں ہوئی۔

ذہنی انتشار اور مایوسی کی یہی وہ کیفیت ہے جس نے ملکی سیاسیات کو عدم استحکام اور ہیجان و اضطراب سے دوچار کر رکھا ہے۔

ان طلبا کے ضمیر بارود کے وہ نہاں خانے ہیں جنہیں ایک چنگاری دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک ہنگامۂ قیامت بن کر بھڑک اٹھتے ہیں ـــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ ملک میں کتنے لوگ ہیں جو طالب علموں کے اس قسم کے سوالات کو قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں جب طالب علموں کو ان سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ تو وہ لامحالہ خارجی احوال و کوائف سے متاثر ہونے لگ جاتے ہیں (مثلاً) وہ بھارت اور پاکستان کی صورتِ حال کا تقابل شروع کر دیتے ہیں۔ اور پاکستان میں جو کچھ اپنے لئے نقصان رساں پاتے ہیں اس کے لئے تقسیمِ ہند کو موردِ الزام ٹھہرا لیتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد پاکستان کو جس قسم کی قیادت سے واسطہ پڑا اکثر اس کا مقابلہ بھارتی لیڈر شپ سے کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں طلبا کچھ یوں محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ پنڈت نہرو نے خواہ کتنی ہی ٹھوکریں کھائی ہوں اس کی روش کتنی ہی نامعقول اور میکیاولی سیاست پر مبنی کیوں نہ ہو اس کے باوجود وہ ایک محبِ وطن ہے۔ بھارتی عوام کی قوت کا راز اسی میں پنہاں ہے۔

بانیٔ پاکستان کے خلاف

اس سلسلے میں خود جناح کی شخصیت بھی تنقید سے بلند نہیں رہتی۔ ایک طالب علم یہ آواز سنتا ہے اور ایسی تحریریں اس کے مطالعہ میں آتی ہیں کہ جناح بڑے خود پسند واقع ہوئے تھے۔ یہ وہ توضیحات ہیں جو ان سوالات کے جواب میں پیش کی جاتی ہیں جو طلبا کے لبوں پر آتے ہیں۔ ان کے سامنے یہ بڑی دور کی کوڑی لائی جاتی ہے کہ جناح کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے لیکن جب کانگریس کے اسٹیج پر گاندھی نے اپنے قدم جما لئے تو خود پسندی کے باعث جناح نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی بعض ہندو لیڈروں نے بھی نئی جماعتیں کھڑی کر لیں ـــــ ان سب کا ردِ عمل بھی، جیسا کہ کہا جاتا ہے وہی ایک تھا۔ مسٹر جناح ہندو مہاسبھا قائم کرنے سے تو رہے اس لئے انہوں نے ایک "مسلم مہاسبھا" قائم کر لی۔ اس طرح وہ ساری قوم کے نہیں، تو کم از کم قوم کے ایک طبقہ کے قائد بن بیٹھے۔ اسے جناح کے نفسیاتی خود پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ بڑا ضدی اور متکبر تھا۔

یہ مارِ آستین کون؟

یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ جب ہم طلبا کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا بچپن۔ ناپختگی اور کم اندیشی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے اس مرحلے پر یہ ممکن نہیں کہ اس قسم کے خیالات ان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جائیں۔ یہ خیالات ان کے دل میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ پیدا بھی کیا کئے جاتے ہیں؟ یہ درحقیقت عکس ہوتے ہیں ان خیالات اور افکار کا جن کا اظہار آئے دن ہمارے واجب الاحترام بزرگوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ حضرات کون ہیں؟

ان میں سرِ فہرست وہ مسلمان ہیں جو تقسیمِ ہند سے قبل تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے ـــــ پاکستان کا وجود ہی ان کی شکست کا جیتا جاگتا نشان ہے ـــــ ان میں آل انڈیا کانگریس کے سابق اراکین، قوم پرست مسلمان ـــ جمعیت العلماء۔ جماعت اسلامی۔ احرار اور سرخ پوش شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے پاکستان

اور قائداعظمؒ کے خلاف سب کچھ کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہی ہیں جو اپنے بچوں کے دل و دماغ میں اس قسم کے شکوک شبہات کو جنم دیتے رہتے ہیں۔

ان کے بعد، ایک دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ تو دیا لیکن انہوں نے کبھی اس تحریک کی اصل و بنیاد کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کا کردار اس انقلاب کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔

تیسرا گروہ ان غیر ملکی عناصر پر مشتمل ہے جو سرکاری یا غیر سرکاری حیثیت سے پاکستان میں قیام پذیر ہیں ہندوؤں کی طرح انہوں نے بھی پاکستان کے تصور کو قبول نہیں کیا۔ یہ حضرات قائداعظمؒ کو اس لئے معاف نہیں کر سکے کہ انہوں نے متحدہ ہندوستان کی افسانوی حقیقت کو باطل ثابت کر دیا۔ وہ متحدہ ہندوستان جو ان کے دماغ کے مطابق جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹ یلغار کے لئے سدِ راہ بن سکتا تھا۔ ذہنی نقطۂ نظر سے یہ حضرات اس صلاحیت سے بے نصیب ہیں کہ آئیڈیالوجی کی اساس پر مبنی قومیت کے انقلابی تصور کو خوش آمدید کہنے کے قابل ہو سکیں۔ بہرحال وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب نظر آتے ہیں کیونکہ طاقت ور اور ترقی یافتہ اقوام کے افراد کی حیثیت سے، انہیں اہلِ پاکستان کے احساسِ کمتری پر اثر انداز ہونے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

جغرافیائی تصور کے پرستار

جغرافیائی قومیت کا تصور اب بھی بین الاقوامی سیاسیات میں غالب اہمیت کا حامل ہے۔ ہمہ تصورات ذہنوں پر شدید گرفت رکھتے ہیں اور جدید نظریات کو ان کے ابتدائی دور میں بہت کم خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

سائنسی ارتقا کی بدولت اہلِ مغرب نے اپنی زندگی میں مذہب سے بیگانگی اختیار کر لی ہے۔ لیکن اس سے انہوں نے اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیا کیونکہ ہر انسان طبعاً ایک مقصد اور نصب العین سے اپنی محبت اور عقیدت کی وابستگی چاہتا ہے اس خلا کو انہوں نے جغرافیائی قومیت کی عقیدت سے پُر کر لیا۔ چنانچہ وہ وطن کے پجاری بن گئے اور میرا وطن حق پر ہو یا باطل پر، کے مقولہ کے مصداق۔ اس تصورِ قومیت میں رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اسلام اور ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس قسم کی حدود و قیود کا نام و نشان تک مٹا دیتا ہے۔ اور اس اساس پر نوعِ انسانی کی تقسیم کو فرسودہ، غیر انسانی اور عہدِ جاہلیت کی یادگار قرار دیتا ہے۔ اور بہ بانگِ دہل یہ اعلان کرتا ہے کہ نوعِ انسانی کی کوئی تقسیم اگر وجہِ جواز رکھتی ہے تو وہ صرف نظریاتی تقسیم ہے۔ آپ دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ رہتے ہوں، کوئی زبان بھی کیوں نہ بولتے ہوں کسی نسل سے آپ کا تعلق کیوں نہ ہو اگر اقدارِ حیات کا اشتراک ہے تو ملک، زبان اور نسل کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہی آئیڈیالوجی کی وجہ اشتراک تھی جو تحریک پاکستان کی بنا قرار پائی ——— کس قدر قابلِ تحسین، انقلاب آفریں

تعمیری اور قابلِ شرف تھی یہ بنیاد ـــــ لیکن کیا انجام ہوا اس آئیڈیالوجی کا؟ وہ لگاہوں سے اوجھل کیوں ہوگئی؟ ہماری تاریخ کا یہ دل دوز المیہ کہ اس انقلاب انگیز تحریک کے تابندہ نقوش قائم کرنے کے بعد اب ہم پھر علاقائی قومیت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ہمارے علاقائی زبانوں کو امتیازی اہمیت دیدی ہے۔ اور ہڑپہ اور موہن جوڈارو کے کھنڈرات سے تہذیب و تمدن کی جداگانہ راہوں کا سراغ لگایا جارہا ہے۔ یہ صورت اختیار کرتے ہوئے ہم نے اس پر قطعاً غور نہیں کیا کہ اگر ہم نے جغرافیائی قومیت کا تصور اپنا لیا تو اس کا نتیجہ (مثلاً) یہ ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے ہندو ہمارے ساتھ مل کر ہمیں قوم قرار پاسکیں گے۔ سوچئے کہ اس کے بعد اس دو قومی نظریۂ حیات کا حشر کیا ہوگا؟ جس کی بنا پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔

منزل سے فرار

صاف نظر آتا ہے کہ ہم ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں اور کوئی ایسا آگے نہیں آتا جو ہماری ابھرتی ہوئی نسل کو تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس سے متعارف کرسکے۔ اس آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا ـــ اس آئیڈیالوجی کو اب کیا ہوا؟ ـــــ اس آئیڈیالوجی کو ہم نے جغرافیائی قومیت کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ایسی صورت میں سوچئے کہ آج کے نوجوان اپنے ذوقِ عمل کی تسکین کے لئے کون سا نصب العین اپنے سامنے رکھیں گے اور ان کا گرم خون اور جذبِ محبت کس مقصد کے لئے کام آئے گا ـــ آخر وہ کون سی اساس ہے جو ملک کے رہنما ہم نوجوانوں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی آئیڈیالوجی کے نعرے پورے زور و شور سے مسلسل اور پیہم سنائی دے رہے ہیں لیکن اس کا ردِّ عمل مایوسی، عدم اعتماد اور بے یقینی کی صورت میں سامنے آرہا ہے ـــ اس لئے کہ

ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

ارشاداتِ قائد کی روشنی میں

میں طلبا کی جماعت سے یہ اپیل کروں گی کہ اگر انہیں کہیں سے بھی ان سوالات کا جواب نہیں مل رہا تو انہیں براہِ راست اس شخصیت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو پاکستان کی دعوت لے کر میدان میں آئی تھی میری مراد قائد اعظمؒ کی ذاتِ گرامی سے ہے انہوں نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ

مطالبہ پاکستان کی وجہ جواز

مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں اپنے ضابطۂ حیات ثقافتی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق نظامِ مملکت قائم کرسکیں،

ہمارا مطمحِ نظر محض آزادی و استقلال ـــــــ کا حصول نہیں بلکہ اس قابل بننا ہے کہ اس کی حفاظت کرسکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب وہ حیدرآباد تشریف لے گئے تو چند نوجوانوں نے ان سے اسلامی مملکت کے بارے میں سوالات کئے اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

اسلامی مملکت کا خصوصی امتیاز

جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس کے زبان اور محاورے کے

مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کے باہمی پرائیوٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود مفہوم یا مقید تصور نہیں۔ میں نہ تو کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔

اسلامی حکومت کا یہ خصوصی امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے اصول و احکام ہیں۔ اسلام میں صلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی ادارہ یا شخص کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ بالفاظ دگر اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی ہیئت نافذہ کا نام ہے۔

حصول پاکستان سے بہت پہلے، ۱۹۴۳ء میں انہوں نے ارشاد فرمایا تھا ——

زمینداری اور سرمایہ داری

اس مرحلہ پر، میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیمات فراموش کر چکے ہیں۔ مفاد پرستی اور خود غرضی نے انہیں اغیار کا آلہ بنا رکھا ہے اور وہ ہوسِ زر کی خاطر یہ سب کچھ روا رکھے ہوئے ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی ہمارے ہاتھوں میں اقتدار نہیں۔ آپ ملک کے کسی حصے کا چکر لگائیے۔ میں خود بہت سے دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں خدا کے لاکھوں بندے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا پاکستان کی جنگ اسی مقصد کے لئے لڑی جا رہی ہے؟ کیا آپ نے اس پر غور کیا کہ لاکھوں انسان اس مہم میں ہنگامہ آرا ہیں اور انہیں ایک وقت کا کھانا میسر نہیں؟ اگر پاکستان کا تصور یہی ہے تو میں اس سے باز آیا۔ اگر یہ لوگ عقل و شعور سے بیگانے نہیں ہوئے تو انہیں زمانے کے تازہ بتازہ ابھرتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ اگر یہ ایسا نہ کر سکے تو پھر ان کا خدا حافظ ہے۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

حصولِ پاکستان کے بعد انہوں نے فرمایا۔

پاکستان کا دستور

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ جمہوری انداز میں اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار ہوگا۔ صورتِ حال کچھ بھی ہو اس مملکت میں تھیاکریسی (THEOCRACY) رائج نہیں ہوگی ۔۔۔ جس میں مذہبی پیشوائیت "منشائے خداوندی" کے نقاب میں اپنا تسلط جمالیتی ہے۔

اور آخر میں، خواتین و حضرات! میں یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ ایک بار پھر ملک کے نوجوانوں کو قائداعظمؒ کا یہ ارشاد یاد دلاؤں ۔۔۔

مستقبل کے معمار

ہم پچھلے دور کے لوگ اپنی جدوجہد کو سرانجام دے چکے لیکن اپنے نوجوان دوستوں کی اس مجلس میں آج رات ماضی کی ان داستانوں کو بھول جانا چاہتا ہوں اور ان نوجوانوں کے دلوں میں ولولہ ہائے شوق کے نئے سوتوں کو حرکت میں لانا چاہتا ہوں کیونکہ یہی وہ ابھرتی ہوئی نئی نسل ہے جو آپ آئندہ کے لئے ہماری ذمہ داریوں کا بوجھ لے کر آگے بڑھے گی۔

یہ ہیں جناحؒ کے وہ ارشادات جو بیس برس قبل فضا میں گونجتے رہے۔ اور یہ آج بھی بعینہٖ اپنی صداقت کے شاہد ہیں۔ والسلام۔

الفتنۃ الکبریٰ

مصر کے نابینا جید عالم مورخ محقق۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین

کا معرکہ آرا کارنامہ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ قرنِ اول کی تاریخ کے نازک ترین دور کی تصویر۔ اپنے موضوع پر لاجواب کتاب کا شگفتہ ترجمہ ـــــ قیمت چھ روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

معاشی مسئلہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا عظیم ترین مسئلہ قرار پا چکا ہے۔ عہدِ حاضر کے مفکرین نے اسے حل کرنے کے لئے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ یہ نظریات انسانی ذہن کے تازہ بہ تازہ تجربات کی پیداوار ہیں۔

اس کے مقابلہ میں

پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیت

اس مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوعِ انسانی کے لئے بارگاہِ رب العٰلمین سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظامِ ربوبیت اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ رعایتی قیمت چار روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷/بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

باب دوم

اساتذہ کی نمائندگی

زاہدہ کاظمی۔ لیکچرار۔ گورنمنٹ کالج فار ووٗمن لاہور۔

تعلیم کا مقصد

صدرِ محترم! معزز خواتین و حضرات!

زندگی کے مسائل عام طور پہ خوشگوار نہیں ہوا کرتے لیکن تعلیم کا بذاتِ خود ایک مسئلہ بن جانا کچھ زیادہ ہی تشویشناک امر ہے۔ درسگاہوں کی اہمیت کچھ سمجھانے کی بات نہیں۔ اسی ماحول میں تو زندگی معنی کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ یہیں مقاصد کا تعین ہوتا ہے۔ یہیں اقوام کی تقدیر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ملک کی درسگاہوں کو نظر انداز کر کے ملک کے سدھار کا خیال سعیٔ بیکار ہے۔ کیونکہ انہیں درسگاہوں میں ملک کے بیشتر مسائل جنم لیتے ہیں۔ اور اگر ہم ایمانداری سے ان مسائل کا حل تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں انہیں کی طرف لوٹنا ہوگا۔

مجھے یہاں کسی محکمے یا ادارے کی (TECHNICAL) تفصیلات یا مشکلات سے بحث نہیں۔ اس وقت زیرِ غور صرف ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ تعلیم کے اس لمبے چوڑے سلسلے کا آخر منتہا کیا ہے؟ وہ کون سے بلند مقاصد ہیں جن کے حصول کی خاطر آپ اور ہم وقت، دولت اور توانائی صرف کرتے ہیں؟

ہمارے ہاں بدقسمتی سے کچھ کرتے رہنے کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ منزل کا تعین ہو یا نہ ہو چل نکلنا لازمی ہے۔ اگر آپ اس راہ میں کسی قسم کے اصولوں کی رہنمائی چاہتے ہیں تو آپ اصول پرست ہیں۔ یعنی بالکل گدھے ہیں۔ اگر آپ اعمال و مقاصد کا تجزیہ کرنے کے لئے کہیں رکتے ہیں تو آپ ذہنی عیاشی میں مبتلا ہیں۔ جو اصول پرستی سے بھی زیادہ ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے ذہنی خلا میں۔ خواتین و حضرات! عمل کسی مخصوص منتہا تک پہنچنے یا کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں رہتا بلکہ مقصود بالذات ہو جاتا ہے۔ زندگی بھی محض زندہ رہنے کا عمل بن جاتی ہے۔ ارتقائی سلسلے کا ایک اہم تجربہ۔ عمل

اس صورتِ حال میں لاشعوری طور پر حقائق و عمل سے فرار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ہماری پڑھائی لکھائی کے سلسلے میں بھی کچھ اسی قسم کی گڑبڑ ہے۔ تعلیم کا یہ پھیلا ہوا کاروبار محض کچھ کرتے رہنے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی مخصوص (PATTERN) نہیں دیتا۔ یہ ہمیں محض پڑھنا اور لکھنا سکھاتا ہے۔ (وہ بھی اتفاقاً انسانی سطح پر سوچنا اور سمجھنا نہیں۔ انگریزوں نے خواتین و حضرات! جب اس سرزمین پر پہلے پہل قدم رکھا تو اپنے دفاتر میں انہیں (NATIVES) کی کلرکانہ خدمات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ جگہ جگہ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ ان میں حکومت کی منشا کے مطابق ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی پسماندگی دیکھ کر سرسید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد اس زمانے کی ضرورت کے مطابق مسلمانوں کو ڈگریاں دے کر سرکاری ملازمتوں کے قابل بنانا تھا۔ اسی اثنا میں قومی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جناحؒ کی قیادت میں ہندوستان کے مسلمانوں کے پیشِ نظر کا واحد منتہا آزادی اور پاکستان تھا۔ کسی قسم کے ذہنی انتشار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ حصولِ پاکستان کے بعد زندگی کو نئے انداز میں ڈھالنا تھا۔ نئی منزل کے لئے نئی راہیں درکار تھیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جن کی خاطر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا نئے ذرائع تلاش کرنے تھے۔

لیکن ——

آخرِ شب کے ہمسفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا — صبح کدھر نکل گئی؟

ویسے تو ماشاء اللہ قوم میں تعلیم کا چرچا عام ہو رہا ہے۔ ہر سال طلباء اور طالبات کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سکول اور کالج کم پڑ گئے ہیں۔ لیکن باوجود اس (ACADEMIC) افراتفری کے ملک کے انفرادی اور اجتماعی مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس پھیلتے ہوئے ذہنی اضطراب کی وجہ کہیں ان مقاصد میں چھپی بیٹھی ہو جنہیں برسوں سے تعلیم کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

خواتین و حضرات! تعلیم کا منتہا محض معلومات بہم پہنچانا نہیں نہ ہی اس معلومات کے وسیع ذخیرے کو امتحانوں میں (REPRODUCE) کر کے ڈگریاں جمع کرنا ہے۔ نہ ہی اس میں غمِ روزگار کا حل تلاش کرنا ہے اور نہ ہی شادی بیاہ کے سلسلے میں (MARKET VALUE) بڑھانا ہے (لڑکیوں کی تعلیم کا خصوصاً یہی مقصد سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں آپ کو اکثر شادی شدہ خواتین چلتی پھرتی سوغاتی نظر آئیں گی اور ادھر ادھر سے دبی ہوئی آواز میں اس قسم کے جملے بھی سننے میں آ جائیں گے "بہن! بس میں چاہتی ہوں کہ کوئی اچھی سی لڑکی ہو۔ دیکھو نا۔ میرا بچہ خیر سے اتنا بڑا ہو گیا ہے لیکن اتنا بھولا بھالا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ دنیا کی اسے خبر ہی نہیں۔ سیدوں میں سے ہو"۔ یا "بھئی سلیمہ! تم ہی کچھ مدد کرو۔ کوئی پیاری سی لڑکی بتاؤ بی اے میں پڑھتی ہو۔ میں اپنے (BROTHER IN LAW) کے لئے

ڈھونڈ رہی ہوں۔ اور وہ دیکھو نا۔ اس قدر تو لائق فائق جیسی۔ ایس۔ پی ہیں۔ ماشا اللہ اور پھر (HANDSOME) بھی کافی ہیں۔ خیر ۔۔۔۔"

تو کہنا یہ تھا خواتین و حضرات! اگر جو تعلیم اس قسم کے مقاصد کو سامنے رکھ کر ان درسگاہوں میں دی جاتی ہے قوم کی اجتماعی یا انفرادی زندگی پر اس کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑتا۔ زندگی ان درسگاہوں میں برسوں کی کاوش کے بعد بھی خام۔ بے معنی اور بے مقصد رہتی ہے۔

اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے نت نئی معلومات سے دل بہلتا رہتا ہے۔ امتحانوں کی بھی اچھی خاصی مصروفیت رہتی ہے۔ ڈویژن کی فکر رہتی ہے۔ زندگی کی اس عارضی گہما گہمی میں کسی اور مقصد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اس چھوٹی سی دنیا سے سرکتے ہی عالم بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ زندگی میں خلا کا شدید احساس ہوتا ہے۔ مایوسی اور ذہنی انتشار کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کائنات کے انتہائی فضول ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ یہ خیال بار بار پریشان کرتا ہے کہ آخر یہ اس قدر محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے زبردست اہتمام کے بغیر بھی کام چل ہی جاتا۔ اگر یہ بھی جانتے کہ پانی پت کی کتنی لڑائیاں ہوئیں یا مرزا غالب کے خطوط کا اردو زبان پر کتنا بھاری احسان ہے تو کیا فرق پڑ جاتا یا یہ سب معلوم کر کے کیا تیر مار لیا۔ وغیرہ وغیرہ

پھر یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کھاؤ پیو اور خوش رہو کی سطح پر اتر آتے ہیں اور اپنی تسلی کے لئے اس بچپنے کو (MATURE) ہونا کہتے ہیں اور باقی اپنے کئے پر دیر تک پشیمان رہتے ہیں اور ماضی کی یاد میں زندگی کے دن پورے کر دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر اپنے ہی حلقوں میں ایک خاتون ہوا کرتی تھیں۔ بلا کی ذہین۔ جب تک پڑھتی رہیں ان کی قابلیت کی دھاک بیٹھی رہی۔ یونیورسٹی کے تمام ریکارڈ انہوں نے ایک ایک کر کے توڑ ڈالے اور ان تمام شاندار معرکوں کے بعد اچانک ان پر انکشاف ہوا کہ یہ سب حماقت تھی اور یہ کہ ان کی اماں جان کی زندگی (جو بالکل ان پڑھ تھیں) نہایت قابل رشک تھی۔

اس قسم کے شدید ذہنی (LAND SLIDE) کے بعد خواتین و حضرات! زندگی میں توازن قائم رکھنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ نہ ہی اس مقام پہ پہنچ کر کسی قسم کے تعمیری عمل کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

اس قسم کی تعلیم جس کا سلسلہ منطقی طور پر کسی خاص منزل کی طرف نہ لے جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو زندگی نشو و نما کر سکتی ہے نہ ہی قوم و ملک کے مستقبل کو سنوارنے میں مدد دے سکتی ہے۔ انسانی سطح پر طریقۂ تعلیم ظاہر ہے کہ طوطوں اور بندروں کو سدھانے اور سکھانے سے قدرے مختلف ہونا چاہیئے۔ "میاں مٹھو چوری کھائی ہے" سیکھ کر انسان کو کسی قسم کی طمانیت کا احساس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی ذات کی تکمیل جو اسے لاشعوری طور پر سرگرداں رکھتی ہے۔ اس سے نہیں ہو سکتی۔ یہ علم اسے خارج سے دیا گیا ہے۔ اس کی اپنی شخصیت کی مضمر صلاحیتوں سے نہیں ابھرا۔ آدمی اور جانور میں یہی فرق ہے۔ جانور ہمیشہ جانور

رہتا ہے۔ لیکن آدمی کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما اور تکمیل کے ذریعہ انسان بننا ہوتا ہے۔ تعلیم اسی ارتقائی سلسلے کا لازمی جزو ہے۔ علامہ فرماتے ہیں سے

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

تعلیم کا مقصد نہ صرف انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ بلکہ بہبودِ انسانیت کے لئے انہیں تعمیری نتائج کی طرف لے جانا بھی ہے۔ ورنہ یہ دھار دار چیز خود حیاتِ انسانی کے لئے خطرے کا موجب بن جائے گی۔ یہاں پہنچ کر خواتین و حضرات! ان مستقل اقدار کی ضرورت پیش آئے گی۔ جن کے قیام کی خاطر ہم تشکیلِ پاکستان کے لئے نکلے تھے۔

ان اقدار کا سرچشمہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی ذہن نہیں۔ وحی آسمانی ہے۔ لیکن ان کا علم محض خارجی معلومات کا ایک حصہ نہیں کیونکہ انہی کی مدد سے آدمی سطحِ انسانیت تک پہنچ پاتا ہے۔

یہی وہ سنگِ میل ہیں جو منزل کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں سمجھ لینا گویا انہیں اپنے وجود میں سمو لینا ہے یہ اقدار ذہن کی دنیا سے اتر کر احساسات کی دنیا کا جزو بن جاتی ہیں۔ یہاں عقل کے ساتھ دل۔ خرد کے ساتھ عشق کا ہونا لازمی ہے علامہؒ کے الفاظ میں سے

خرد سے راہرو روشن بصر ہے	خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا	چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

یہ ہنگامہ ہائے عشق، مستقل اقدار پر ایمانِ محکم کا ہے جو حیاتِ انسانی کا مقصد متعین کرتا ہے۔ اسے معنی بخشتا ہے۔ ان اقدار کی رہنمائی میں انسان کا ہر عمل اسے تعمیری نتائج کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اسی میں اس کی اپنی ذات کی تکمیل کا راز پوشیدہ ہے۔

تعلیم یہاں زندگی کے بنیادی اور عملی مسائل کا حل بن جاتی ہے۔ اور ایک (IDEAL) معاشرے کے قیام میں مدد دیتی ہے۔ تعلیم یہاں انسان میں خدائی صفات کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تعلیم یہاں انسان کے اس بنیادی سوال کا کہ میں کیوں زندہ ہوں" جواب دیتی ہے۔ تعلیم یہاں زندگی کے بکھرے ہوئے ٹکڑیوں کو جمع کر کے اس کی ازلی اور ابدی شکل کو واضح کرتی ہے۔ والسّلام۔

خریداروں کی خصوصی توجہ کے لئے

ادارہ طلوع اسلام سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کیجئے ورنہ تعمیلِ ارشاد نہ ہو سکے گی ——— (ناظم ادارہ)

شمیم انور - لیکچرر، کینرڈ کالج - لاہور

طلبا اور مذہب

(ایک عمیق فکری جائزہ اور تفصیلی تبصرہ)

(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

صدرِ محترم - خواتین و حضرات!

آج کے اجتماع میں، میں نے اپنے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے وہ درحقیقت ایک گہرے فکری عمل کا کرب انگیز جائزہ ہے۔ اس سے پہلے، جوانی یا طالب علمی کے زمانے کو بے فکری اور غیر ذمہ داری کا ایسا مسرت آمیز عہد کہا جاتا تھا جس کی یاد بڑھاپے تک قائم رہتی اور وجۂ رشک سمجھی جاتی تھی۔ لیکن حضرات! یقین مانئے کہ اب نہ تو نوعمری کا یہ زمانہ پُرمسرت ہوتا ہے اور نہ ہی طالب العلم کی زندگی، حصولِ علم و تحقیق کی خوش گوار مسلسل آرزو کی تعبیر۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج دکھائی یوں دیتا ہے گویا پاکستانی طالب العلم کی زندگی انتہائی بے فکری کی لاابالانہ زندگی ہے۔ لیکن یہ محض ایک نقاب ہے جو اس سے یکسر مختلف حقیقت پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس فریب نگاہ نقاب کو الٹ کر حقیقی چہرے کو آپ کے سامنے لاؤں جو خود ہماری اپنی پیدا کردہ تلخ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اگر یہ حقیقت آپ کو بھیانک اور ناخوشگوار نظر آئے تو مجھے اس کا افسوس ہے اور مجھے ایسا کہنے میں معذور سمجھئے کہ ہمارا آج کا بدقسمت طالب العلم ——— جس پر چاروں طرف سے پھٹکار پڑ رہی ہے ——— خود ہمارے اپنے اعمال و اقوال کا آئینہ ہے۔

ہمارا آئینہ

اگر آپ اس آئینہ کو توڑ ڈالنے کی کوشش کریں گے تاکہ آپ کو اس میں اپنی بھیانک شبیہ نظر نہ آئے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ آئینے کے توڑ دینے سے بھیانک چہرے حسین نہیں بن جایا کرتے۔

خواتین و حضرات! ایک ایسی فضا میں جو سطحی جذبات، مذہبی دیوانگی اور رسمی مذہبیت کی شدت سے معمور ہے، مذہب کے متعلق علم و عقل اور دلیل و برہان کی روشنی میں گفتگو کرنا ایک ایسی وادی میں قدم رکھنا ہے جہاں فرشتوں

کے بھی پر جلتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس نے مجھے اس پر آمادہ کر دیا ہے کہ میں ایسی پُرخار وادی میں قدم رکھوں؟ سب سے پہلے یہ کہ اس قسم کے پُرخطر راستے پر گامزن ہونا اور اس طرح ایسے ہمت طلب اور صبر آزما چیلنج کو قبول کرنا بجائے خویش اپنے اندر ایک لذت رکھتا ہے۔ جن وادیوں میں اُترے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے ہوں اُن میں اگر انسان نہیں اترے گا تو اور کون قدم رکھے گا؟

ہمت طلب مرحلہ

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں ۔۔۔ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اور دوسرے یہ کہ سطحی جذباتیت اور مذہبی دیوانگی کے اس پُرشور بحرِ متلاطم میں طلوعِ اسلام نے علم و عقل کا ایک ایسا پُرسکون جزیرہ مہیا کر دیا ہے جہاں کھڑے ہو کر معقول بات کی سُنی جا سکتی ہے۔ پاکستان بھر میں کوئی دوسرا پلیٹ فارم ایسا نہیں جس سے آپ کامل اعتماد اور اطمینان کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ سکیں اور دوسرے کی سُن سکیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ ہمارے ہاں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں اس پُرسکون جزیرے کا علم ہے۔ کاش اس کا علم عام ہو جاتا تاکہ ایسے حقائق جو سینوں میں دبے کے دبے رہ جاتے ہیں صداقت کے متلاشی کانوں تک پہنچ سکتے۔ اگر یہ پلیٹ فارم نہ ہوتا، تو میں اس قدر نازک موضوع پر آپ سے گفتگو کر سکتی، نہ آپ کو کوئی میری بات سننے دیتا۔ کتنا بڑا احسان ہے طلوعِ اسلام کا اربابِ فکر و نظر پر ـــــ طلوعِ اسلام زندہ باد۔ میری ممنونِ احسان نگاہیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

طلوعِ اسلام کا احسان

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرا موضوع ہے ـــــ طلبا اور مذہب ـــــ ایک طالب العلم کی مذہبی مشکلات کی ابتدا اس کے گہوارے سے ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولتا ہے جس کی فضا قدامت پرستانہ مذہبیت سے لبریز ہوتی ہے۔ محترم پرویز صاحب نے اپنے دیروزہ خطبۂ استقبالیہ میں دین اور مذہب کی کشمکش کو جس اُجلے اور نکھرے انداز سے پیش کیا ہے اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جس بچے کی تعلیم و تربیت اس قسم کے مذہبی ماحول میں ہوئی ہو، اس کی ذہنی ساخت کس قسم کی ہو جاتی ہے۔ وہ ذہنی ساخت جس کی رُو سے اس معاشرتی معاشی اور سیاسی اندازِ زندگی میں جو ہمارے ہاں صدیوں سے متوارث چلی آ رہی ہے، ذرا سی تبدیلی بھی کفر و الحاد سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ اس طالب علم کے خاندان کے نقطۂ نگاہ سے، لباس کی تراش خراش، بالوں کی وضع قطع یا جوتے کی طرز اور ساخت میں تھوڑا سا تغیر بھی خلافِ مذہب تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک، وہ رہنے سہنے کا ڈھنگ، اٹھنے بیٹھنے کا طریق، اوڑھنے بچھونے کا انداز، جو بزرگوں سے متوارث چلا آتا ہے اس قدر مقدس ہے کہ اس سے ذرا سا اختلاف، انسان کو جہنم میں پہنچا دیتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ان کے نزدیک "تغیر" کا لفظ (ان کے تصور کے) خدائے مطلق کے خلاف بدترین گناہ ہے۔

گھر کی فضا کا اثر

اس طالب علم کو گھر کا ماحول اس قسم کا ملتا ہے۔ وہ اس سے باہر قدم نکالتا ہے تو یہی مشکل اسے چاروں طرف سے اور شدت کے ساتھ گھیر لیتی ہے۔ قدم قدم پر اس کا سامنا ان لوگوں سے ہوتا ہے جو اُسے ایسی مشکوک اور عقارت آمیز

معاشرہ کی فضا

نگاہوں سے دیکھتے ہیں، گویا وہ ایک مفرور اشتہاری" مجرم ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نوجوان طالب العلم ایسی باتیں کرتا ہے جو ان لوگوں کی اور ان کے اسلاف کی باتوں سے مختلف ہیں۔ عوام کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک گناہِ عظیم ہے جس کا مرتکب یہ نوجوان طالب العلم ہوتا ہے۔ یہ اسے مجرم سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ایک ایسے قیدخانہ میں محبوس پاتا ہے جہاں کسی قسم کی حرکت کی اجازت نہیں۔ قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس کی زندگی ایک طالب العلم کی زندگی ہے —— سیکھنے کی زندگی - آگے بڑھنے کی زندگی —— سمجھنے سوچنے کی زندگی —— وہ دن کا بیشتر حصہ اسکول یا کالج میں گزارتا ہے۔ جہاں وہ ہر روز نئی بات سیکھتا اور نیا علم حاصل کرتا ہے۔ وہاں کا طریق یہ ہے

مدرسہ کا انداز

کہ جو بات سنو اسے عقل و فکر کی رُو سے سمجھو اور جو بات کرو اس کے متعلق پہلے سوچو کہ وہ علم و دلیل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اسے اجازت ہوتی ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے اس کے متعلق پوچھے —— بار بار پوچھے - ہزار بار پوچھے - اور جب تک وہ علیٰ وجہِ البصیرت مطمئن نہ ہو اسے کبھی تسلیم نہ کرے۔ درسگاہ میں ملک و ملت کے تمام معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ ان کے متعلق طلبار آزادانہ بحث کرتے ہیں۔ اپنے اعتراضات بلا جھجک پیش کرتے ہیں ان پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ہمارا طریق تعلیم کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو اتنی بات ضرور ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ایسا ماحول موجود ہوتا ہے جس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کا جذبہ بیدار۔ اس زمانے میں جب کہ دنیا کی ہر شے برق رفتاری سے بدل رہی اور آگے بڑھ رہی ہے۔ جب کہ انسان اس خاکدان سے اُبھر کر چاند

نوجوان کا قلبِ بیقرار

اور سورج پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمارا نوجوان طالب علم فطری طور پر تغیر چاہتا ہے۔ اس کے قلبِ بیقرار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

زشررستارہ جویم - زستارہ آفتابے

لیکن اس کے برعکس جب وہ اُس ماحول اور معاشرہ کو دیکھتا ہے جن میں اسے زندگی کے دن گزارنے پڑتے ہیں اور جس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے   وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

تو جمود و تعطل کے اس مفلوج معاشرہ میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آئینی و رسوم کہن کی ان زنجیروں کو توڑ کر جن میں وہ بُری طرح جکڑے بیٹھا ہے، آگے بڑھ جائے اور سرفرازانہ انداز سے دیگر اقوامِ عالم کے دوش

پہلی کشمکش

بدوش چلنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن اس کا فالج زدہ معاشرہ اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے اور اس کی تغیر و ترقی کی ہر آرزو کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ حالات یقیناً ایسے ہوتے ہیں جو اسے اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ معاشرہ کے آئین و ضوابط سے سرکشی اور بے باکی اختیار کرے لیکن وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا۔

وہ معاشی طور پر اپنے خاندان اور معاشرہ کا محتاج ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجبوری اور بے چارگی انسان کے دل میں سرکشی کی آگ کو اور بھی زیادہ مشتعل کر دیتی ہے۔ چنانچہ یہ نوجوان طالب العلم، معاشرہ کے خلاف بغاوت تو اختیار نہیں کرتا لیکن اپنے جذبات بغاوت کی تسکین کے لئے دوسرے راستے تلاش کرتا ہے۔ وہ گھر میں بڑوں کے سامنے گستاخی کے ساتھ پیش آتا۔ اور بھائی بہنوں کے ساتھ جھگڑے نکالتا ہے۔ اس سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی تو وہ اپنی موٹر سائیکل کو جھکڑ کی طرح تیز چلا کر ٹریفک کے قاعدوں کو توڑتا ہے۔ اس میں اسے لذت ملتی ہے اور یوں اس کی وہ توانائیاں جو تعمیر میں صرف ہونی چاہیے تھیں، تخریب کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ہر چیز کو توڑ کر رکھ دے یہ اس کی نفسیاتی ترغیب کا تقاضا بن جاتا ہے۔

ہمارے نوجوان طالب علموں کی مذہبی مشکلات کا دائرہ ان کے گھر کے صحن یا عام معاشرہ کی جولانگاہ تک محدود نہیں رہتا۔ ہمارے مذہبی اجارہ دار خاص طور پر اس کے دل میں ایک کرب انگیز کشمکش پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ وہ مسجد کے منبر سے واعظ کے خطبات کو بڑی توجہ سے سنتا ہے۔ وہ علمائے دین کی ان بلند آہنگ

مذہبی اجارہ داروں کی روش

تقاریر کو بھی دل کے کانوں سے سنتا ہے۔ جن میں وہ بزعم خویش، اسلامی اقدار کی عظمت و افضلیت کو سحر کارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں لیکن جب وہ ان کی باتوں کو علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھتا ہے تو وہ اسے قطعاً اپیل نہیں کرتیں۔ وہ جن باتوں کو دین کا ستون اور جن اقدار کو مذہب کی بنیاد کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ اسے ملوکیت کے اس عہد کی یادگار نظر آتی ہیں۔ جب انسانیت بری طرح زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے کہ دین کے یہ علمبردار۔ تھیاکریسی کی آمریت۔ جاگیرداری۔ زمینداری۔ غلامی اور عورتوں کے خلاف انسانیت سوز سلوک کو عین اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ عام حالات میں اس طالب علم کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ان باتوں کو ان حضرات کی جہالت پر محمول کر کے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھتا۔ لیکن اس باب میں اس کے سامنے ایک اور مشکل آجاتی ہے جو صورت حالات کو نازک تر بنا دیتی ہے۔ یہ حضرات عہد کہن کے ان تمام مستبدانہ اداروں (ملوکیت۔ سرمایہ پرستی۔ غلامی وغیرہ) کو منسوب کر دیتے ہیں۔ ان گرامی قدر ہستیوں کی طرف جن کا اس کے دل میں بڑا احترام ہوتا ہے وہ ان

ایک اور کشمکش

انسانیت سوز اداروں اور جہالت آمیز پرستاروں کی تائید میں ایسے اقوال پیش کر دیتے ہیں جن کے متعلق یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ وہ ان واجب التکریم ہستیوں کے ہیں۔ ایک طرف وہ نوجوان ان ہستیوں سے اپنا قلبی رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری طرف اسے یہ ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ہستیاں ان نظریات تصورات اور نظام زندگی کی مؤید بلکہ حامل تھیں جنہیں اس کا دل ایک ثانیہ کے لئے بھی صحیح ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اس سے وہ بے چارا ایک عجیب نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو کچھ اسے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے اس کا دل اسے صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ دوسری طرف اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ارشادات رسول اللہ اور فرمودات صحابہؓ کبارؓ ہیں۔ اگر انہیں نہیں

مانیں گے تو تم سچے مسلمان نہیں رہ سکتے۔ اب آپ اندازہ فرمائیے کہ وہ بیچارا کس کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان باتوں کو نہیں مانتا تو وہ "ملا" کی نگاہ میں کافر ہو جاتا ہے۔ اگر مانتا ہے تو خود اپنی نگاہوں میں کافر بن جاتا ہے۔ خواتین و حضرات! کیا آپ نے کبھی اس نوجوان کے دل میں جھانک کر دیکھنے کی ہمت کی ہے کہ اس میں کیا قیامت برپا ہوتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ اس کا سینہ کس طرح طلسم پیچ و تاب بنا رہتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس اضطراب کا اندازہ لگایا ہے جس میں وہ اس طرح مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کی طرف بے اعتنائی برتنے لگ جاتا ہے یا کھلے بندوں سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ آپ اسے اس کی بے اعتنائی پر مطعون کرتے اور اس کی سرکشی پر ڈانٹتے ہیں لیکن آپ نے کبھی اس پر غور کرنے کی تکلیف بھی گوارا کی ہے کہ اس کی اس بے اعتنائی اور سرکشی کا ذمہ دار کون ہے؟ جو اسے اس مقام تک لے کر آیا ہے؟ ایک معلم کی حیثیت سے میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب اس قسم کی کشمکش میں گرفتار طالب علم کو بتایا جائے

حقیقت کشا تعلیم

کہ جن باتوں کو حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ ان کی نہیں ہیں اور دلائل و براہین سے اسے اس کا قائل کرا دیا جائے تو اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے گویا اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے دل کا اطمینان اس کے چہرے سے نمایاں طور پر نظر آ جاتا ہے۔ ان واجب الاحترام ہستیوں کی تعظیم اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔ وہ اس الجھن سے آزاد ہو جاتا ہے جس نے اس کے دل کو عجیب کشمکش کی آماجگاہ بنا رکھا تھا اس سے اس کو بڑا سکون ملتا ہے۔

لیکن یہ مسئلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ کہنا کہ رسول اللہؐ نے ایسا نہیں فرمایا تھا اور اسلام یہ نہیں، اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو ہے۔ وہ طالب علم یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کیا تھا، اور اسلام کہتے کسے ہیں؟ دین ہے

اسلام ہے کیا؟

کیا؟ محراب و منبر سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ اس مسئلہ کے لئے ارباب سیاست کی طرف رُخ کرتا ہے اور یہاں اسے ایک اور کشمکش کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اخبارات کو اٹھاتا ہے۔ ان میں اسے "اسلامی آئیڈیالوجی"۔ "اسلامی طرزِ زندگی"۔ "اسلامی اقدار" جیسے جاذب نگاہ عنوانات جلی حروف میں لکھے ملتے ہیں۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے دل میں لئے ان کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ وہ اخبار کے کالم کے کالم پڑھ ڈالتا ہے لیکن ان میں اسے ان عنوانات کا مفہوم کہیں نہیں ملتا ۔۔۔ پُرشکوہ الفاظ لیکن بے معنی۔ بلند بانگ سلوگن لیکن بے مطلب۔ اور یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں۔ سال کے ۱۲ مہینے اور مہینے کے تیس دن یہی بے معنی الفاظ اور بے مطلب سلوگن اس کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس سے وہ اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے اس سوال کا جواب کہیں نہیں ملتا کہ اسلامی آئیڈیالوجی بالآخر ہے کیا؟ اسلامی نظامِ حیات کہتے کسے ہیں؟ ایک پاکستانی ہونے کی وجہ سے وہ اس سوال سے صرفِ نظر بھی نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اسے بتایا گیا ہے کہ پاکستان کی ہستی کی وجۂ جواز اسلامک آئیڈیالوجی ہے۔ اس سے ایک ایسی صورتِ حالات پیدا ہو جاتی ہے جس میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ارباب سیاست اور اصحاب حل و عقد

کوئی متعین مفہوم نہیں

جو اپنے مفاد کے حصول کی خاطر دن رات اسلامی آئیڈیالوجی کے نعرے بلند کرتے اور اسلامی نظام حیات کے الفاظ دہراتے ہیں ان میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی یہ محسوس بھی کیا ہو کہ ان کی اس بے معنی نعرہ بازی سے قوم کے نوجوان طالب علموں پر کس قدر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ وہ اسکول اور کالج میں دیکھتا ہے کہ جو مضمون بھی اسے پڑھایا جائے، اس کے شروع میں واضح الفاظ میں بتایا ہوتا ہے کہ اس مضمون سے مطلب کیا ہے؟ جو اصطلاحات ان میں آئیں گی ان کی (DEFINITION) کیا ہے اور ان کا متعین مفہوم کیا۔ لیکن وہ اہم سوال جس سے اس صفحۂ ارض پر اس کی ہستی کا بنیادی تعلق ہے وہ اس طرح مبہم چھوڑ دیا جاتا ہے کہ گویا اس کی وضاحت کی کسی کو ضرورت ہی نہیں۔

اس گوشے میں اسے اسلام کا کوئی متعین مفہوم نہیں ملتا۔ اگر یہ مفہوم کہیں ملتا ہے تو وہ مختلف مذہبی فرقے ہیں۔ ان میں سے ہر فرقہ یہ بتاتا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ (یعنی ہر فرقے کے نزدیک اسلام وہ ہے جس پر وہ کاربند ہے) لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس طرح فرقہ وارانہ اسلام کو متعین کرنے کا نتیجہ سوائے باہمی خوں ریزی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ادکاڈہ کی ایک مسجد میں عشا کی نماز کے وقت ایک قسم کے اسلام کے مدعیوں نے دوسری قسم کے اسلام کے مدعیوں پر حملہ کیا اور کتنے نمازی وہیں قتل ہو گئے یا زخمی۔ وہ ان واقعات کو دیکھتا ہے اور مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے کہ یہ تماشا کیا ہے۔ اگر اسلامک آئیڈیالوجی کے مفہوم کو غیر متعین چھوڑا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ فکر و نظر کی پریشانی اور عملی تعطل ہوتا ہے۔ اگر اسے متعین کیا جاتا ہے تو اس سے فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں برپا ہوتی ہیں۔ اگر وہ ارباب شریعت سے پوچھتا ہے کہ یہ خوں ریزیاں کیوں ہوتی ہیں تو اسے جواب یہ ملتا ہے کہ یہ سب علمائے سوء کی کارستانیاں ہیں۔ یعنی یہ لوگ اپنے جرائم کے لئے "علمائے سوء" کو قربانی کا بکرا بنا دیتے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ اگر یہ فرقہ بندیاں اور اس سے پیدا شدہ خرابیاں "علمائے سوء" کے کارنامے ہیں تو وہ علمائے حق کہاں ہیں جو صحیح اسلام کی طرف راہ نمائی کر سکیں۔ اس کا جواب ہر فرقہ کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ ان کے فرقہ کے علماء "علمائے حق" ہیں اور باقی فرقوں کے عالم "علمائے سوء" ہیں۔

مذہب اور سیاست کی وحدت

طالب العلم کی مذہبی مشکلات کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا یہ آگے بھی چلتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ (کم از کم پاکستان میں) مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ یہ ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ لیکن جب وہ اس دعوے کو بغور دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ یہ عملاً غلط ہے۔ عملی طور پر مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے یکسر الگ ہیں۔ مثلاً وہ سوچتا ہے کہ کسی بزرگ کے مزار پر فاتحہ خوانی کا روزمرہ کی عملی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ غلاف کعبہ کا جلوس، ملک کی تمدنی زندگی کے مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے؟ حج کا اجتماع عظیم جہاں اطراف عالم کے مسلمان جمع ہو جاتے ہیں ان کی سیاسی مشکلات کے حل کرنے کے لئے کیا راہ نمائی

دیتا ہے۔ ان حقائق پر غور کرنے سے وہ اس کے سوا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا کہ اسلام بھی، دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب اور انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ یہ ہماری تمدنی زندگی کا کوئی حل پیش نہیں کرتا۔ اس سے وہ اسلام کے ایک عملی نظامِ زندگی ہونے کے تصور کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ مایوسی اس کے دل میں پھر وہی کشمکش پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس کشمکش سے وہ مذہب اور سیاست دونوں کی طرف سے بے اعتنائی برتنے لگ جاتا ہے۔

یہ حضرات جو طالب العلم کی اس تمام ذہنی کشمکش اور قلبی ہیجان کا موجب ہیں۔ (ہر طرف سے لاجواب ہو کر) ماضی کی تاریخ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ عہدِ ماضی کو تابندہ و درخشندہ قرار دیتے اور اسے "اسلامی تاریخ" کہہ کر پکارتے ہیں

ہماری تاریخ کی پناہ گاہ

وہ اس عہد کو اپنی تاریخ کا زریں باب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے زریں و تابناک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں صحیح اسلام موجود تھا۔ اور اس کے پیرو سچے مسلمان تھے۔ یہ طالب العلم امیدوں کی ایک نئی دنیا جلو میں لے کر اس تاریخ کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ جو "اسلامی تاریخ" کے نام سے اس کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔ لیکن اس تاریخ میں ماضی کی جو تصاویر اس کے سامنے آتی ہیں انہیں دیکھ کر وہ ششدر اور حیران رہ جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان بھی طرح باہمی جنگ و قتال میں مصروف ہیں۔ وہ ایک اور ورق الٹتا ہے تو اس میں اسے نظر آتا ہے کہ مستبد ملوکیت اور غاصب نظامِ جاگیرداری کس طرح غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ وہ اور آگے بڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کس طرح درد و غم سے کراہ رہی ہے۔ وہ اس "درخشندہ ماضی" کے حرم کے اندر جھانکتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ بیکس اور بے بس عورت کس طرح جابر و سرکش مرد کے پاؤں تلے کچلی جا رہی ہے۔ بیشک وہ "قرنِ اول جو صحیح اور سچے مسلمانوں کی زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ" کہنا چاہئے جب وہ اس کی اس تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے جسے ہمارے قدیم مورخین نے مرتب کیا ہے تو اسے وہاں بھی بڑے تاسف انگیز مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمارے پاس قرآن کی شہادت موجود ہے کہ قرنِ اول کے مسلمان فی الواقعہ پکے اور سچے مسلمان تھے اور ان خوبیوں کے مالک جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ وہ عہد فی الحقیقت مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی تاریخ میں قابلِ رشک عہد ہے جو انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جانے کے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔ اس عہد کی صحیح تاریخ قرآن میں محفوظ ہے نہ کہ ہمارے مورخین کی افسانہ طرازیوں میں۔ لیکن طالب العلم کو یہ نہیں بتایا جاتا۔ اسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ مورخین بھی بالآخر انسان تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح اپنے ماحول سے متاثر۔ ان کی مرتب کردہ تاریخ وحیٔ آسمانی نہیں جو سہو و خطا سے پاک ہو۔ یا اس میں مورخ کے ذاتی رجحانات، نظریات اور معتقدات کی رنگ آمیزی نہ ہو۔ اس لئے اس تاریخ کا ہر لفظ قابلِ اعتماد نہیں قرار پا سکتا۔ چونکہ طالب العلم کو یہ نہیں بتایا جاتا (بلکہ اس کے برعکس اس تاریخ پر بھی تقدس کا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے) اس لئے وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلام ایک ناقابلِ عمل نظامِ زندگی ہے۔ اس پر نہ کبھی عمل ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اس سے اس کے ماننے اور تاریک ہو جاتے

ہیں۔ اور وہ اس بھول بھلیاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں پاتا۔ جس میں اسے دھکیل دیا جاتا ہے۔

اگر پاکستانی طالب العلم کو اس گورکھ دھندے میں نہ الجھا دیا جاتا، بلکہ اسے اس کی صوابدید پر تنہا چھوڑ دیا جاتا تو شاید اس کی کیفیت موجودہ حالت کے مقابلے میں بہتر ہوتی۔ اسے، اربابِ شریعت اور اصحابِ سیاست کی سیرت و کردار کے مطالعہ سے جو تجربہ حاصل ہوتا اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ جاتا کہ جس مذہب اور طریقِ زندگی کو اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ کبھی حقیقی اسلام نہیں ہو سکتا — یعنی وہ مذہب جو زندگی کے کسی مسئلہ کا عملی حل پیش نہیں کرتا۔ جو معاشی، معاشرتی اور تمدنی ترقی کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ جو توہم پرستیوں کا مجموعہ اور علم و عقل کا دشمن ہے جو اس دنیا کو قابلِ نفرت قرار دے کر صرف آخرت کی نجات کو مقصودِ زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ اس مذہب کے خلاف بغاوت کرتا اور اس سے اس کے راستہ کی تاریکیاں چھٹ جاتیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر اسے ایک اور مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا اور وہ ہے مغربی پراپیگنڈہ کا بھوت۔

مغربی پراپیگنڈہ کا اثر

مغرب کے سامنے اس وقت سب سے اہم مسئلہ کمیونزم کی روک تھام ہے۔ یہ اس کے اعصاب پر بُری طرح سوار ہے۔ وہ اس خطرے سے مدافعت کے لئے ہر وقت نئے نئے حربوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس قسم کا ایک حربہ (ان کی دانست میں) مذہب ہے۔ چنانچہ دنیا کے مذہب پرستوں کو آواز دی جاتی ہے کہ وہ "خدا کی منکر کمیونزم" کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں دوہرا واسطہ دیا جاتا ہے — ایک واسطہ نفسِ مذہب کا، اور دوسرا واسطہ یہ ہے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں سامی مذاہب ہیں۔ یعنی چونکہ اسلام اور عیسائیت دونوں کے بانی سامی النسل تھے، اس لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کو مزید یک نظر ہونا چاہیئے — اس مقام پر مجھے ضمناً یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ سامی النسل مذاہب (عیسائیت اور اسلام) کے یہ مدعی وہی ہیں جنہوں نے سامی النسل، مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے قلب میں سامی النسل یہودیوں (فلسطین کی اسرائیلی) حکومت کا خنجر بھونک رکھا ہے۔ پھر یہ وہی لوگ ہیں جو ایک طرف ہمیں سامی النسل مذہب کے پیروکار ہونے کی جہت سے دعوتِ اتحاد دیتے ہیں اور دوسری طرف آریائی بھارت کی حوصلہ افزائی کر کے اسے "سامی اسلام" کے علمبردار، پاکستان کے خلاف کھڑا کئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے ان کی دیانت کا عالم! بہرحال میں کہہ یہ رہی تھی کہ مغرب کے نزدیک مذہب محض ایک سیاسی حربہ ہے جس کا وہ شد و مد سے پراپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اس پراپیگنڈے سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ ان کا سیاسی اور معاشی نظام مذہب کی بنیادوں پر استوار نہیں۔ وہاں مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن پاکستانی طالب العلم پر اس کا اثر بڑا معز پڑتا ہے۔ مغرب نے جو ترقی علوم سائنس میں کی ہے اس کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کے دل پر ان کی فکری برتری کا احساس غالب ہے۔

مغرب سے مرعوبیت

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ اہلِ مغرب کی زبان سے مذہب کی عظمت اور فوقیت کے قصیدے سنتے ہیں تو مذہب کے خلاف بغاوت کا جو جذبہ ان کے قلب کی گہرائیوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا وہ پھر سے

سوجاتا ہے اور یوں انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی اوہام پرستیوں سے نکلنے کے جو امکانات اس کے سامنے روشن ہو چلے تھے ان کے دئیے پھر ٹمٹمانے لگ جاتے ہیں۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں

ایک اور خطرناک تصور جو بدقسمتی سے ہمارے طالب علموں کے دل میں جاگزیں کیا جارہا ہے یہ ہے کہ "مذہب میں عقل کا کوئی دخل نہیں"۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تصور مغربی مصنفین نے اس مقصد کے لئے وضع کیا ہو کہ اس کے ذریعہ عیسائیت کو سائنس کے بے پناہ حملوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض مغربی مفکر دیانت داری سے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ محدود عقل انسانی ادراک حقیقت نہیں کر سکتی۔ پاکستانی علمائے مذہب اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ وہ اپنی اوہام پرستیوں کی تائید میں مغربی مصنفین اور مفکرین کے ایسے اقوال بڑی شد و مد سے پیش کرتے ہیں جن میں عقل کو نشانہ بنایا گیا ہو۔ پاکستانی طالب العلم جو مغربی مفکرین کی علمی فضیلت سے مرعوب ہے ان کے ان اقتباسات سے بڑا متاثر ہوتا ہے۔ اہل مغرب کو اس تصور سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ مذہب میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے کہ وہاں مذہب گرجہ کی چاردیواری کے اندر محدود رہتا ہے۔ لیکن پاکستان میں یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی کے تمام عملی نظریات و نظام کی اساس مذہب پر ہے۔ اس سے بے چارا طالب العلم ایک اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ زندگی کے تمام عملی مسائل کی بنیاد علم و عقل پر ہے ــــ سیاست۔ تمدن۔ معیشت۔ معاشرت سے متعلق سوالات عقل کی رو سے سمجھے اور سلجھائے جاتے ہیں۔ اب اگر ان تمام سوالات کی بنیاد مذہب پر ہے اور مذہب میں عقل کو دخل نہیں تو وہ حیران اور پریشان ہو جاتا ہے کہ ان مسائل کا صحیح حل ہی کیسے نکلے گا۔ (مثلاً) وہ سمجھ نہیں سکتا کہ زمیندار اور کاشتکار یا سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات۔ ملک کی درآمد برآمد کی پالیسی۔ تبادلۂ زر۔ پارلیمانی یا صدارتی نظام حکومت۔ نکاح اور طلاق۔ یا تین سالہ ڈگری کورس یا اس قسم کے دیگر عملی "مسائل حیات" سے اگر عقل کو الگ کر دیا جائے تو یہ مسائل حل کیسے ہو سکیں گے؟ ان معاملات زندگی کی اساس وہ مذہب کیسے بن سکیگا جس میں عقل کو کوئی دخل نہ ہو۔ ان خیالات سے طالب العلم کے دل میں شکوک و شبہات کے انبار لگ جاتے ہیں اور اس کی خود اعتمادی کا جذبہ متزلزل ہو جاتا ہے۔

عقل کو مذہب سے الگ کر دینے کا ایک اور منطقی نتیجہ بھی ہے جسے کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام اور دیگر مذاہب

مسلمان طالب علموں کو بتایا جاتا ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور مکمل دین ہے اور دنیا کا کوئی مذہب اس کے مدمقابل نہیں آسکتا۔ (یہ ایک حقیقت ہے) دیگر مذاہب اوہام پرستی اور خرافات کا مجموعہ ہیں۔ ان کی تعلیم، علم و بصیرت کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن جب ایک طالب علم یہ سنتا ہے کہ مذہب میں عقل کو کوئی دخل نہیں تو وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے مذاہب کو اس بنا پر باطل قرار دے دیں کہ وہ عقل کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ وہ کہتا ہے کہ اس اصول

کے مطابق ایک ہندو کو حق حاصل ہے کہ وہ وشنو، شیو اور برہما کے پیکر کی پرستش کرے یا گائے کو مقدس سمجھے۔ ایک عیسائی حق بجانب ہے کہ وہ تثلیث کے عقیدے کو صحیح مانے۔ اسی طرح جیسے ایک مسلمان سمجھتا ہے کہ وہ جانوروں کی قربانی سے خدا کو خوش کر سکتا ہے یا غلافِ کعبہ کا کپڑا تعظیم اور تقدیس کا مستحق ہے ان خیالات کی روشنی میں وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ اسلام کی افضلیت کی دلیل کیا ہے؟ جب اسلام کو بھی دیگر مذاہب کی سطح پر رکھ دیا جائے تو اس سے جو خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کی عظمت، برتری اور فوقیت ــــ اور خدا کا سچا دین ہونے کے یقین ــــ کو جاگزیں کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم انہیں بتائیں کہ اسلام میں علم، بصیرت اور عقل و فکر کا مقام کیا ہے؟ اور مغربی مصنفین کا یہ پراپیگنڈہ کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں، کس مقصد کو بروئے کار لانے کا حربہ ہے۔

اسلام میں عقل کا مقام

مغربی مصنفین کے پراپیگنڈہ کے ذکر سے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو ابھی دو تین دن ہوئے سامنے آیا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر شمل تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے ہسٹری کانفرنس (لاہور) کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اسلام میں تصوف کی اہمیت پر بڑا زور دیا اور اس ضمن میں "ہند و پاک"

تصوف

کی تاریخ کے پس منظر میں اسے اجاگر کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ تصوف ہمارے عہدِ انحطاط کی پیداوار اور مسلمانوں کے زوال کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔ مغربی مفکرین، مورخین اور مصنفین اس کی اہمیت کو اجاگر ہی اس لئے کرتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو "ذکر و فکرِ صبحگاہی" میں مست رکھا جائے تاکہ یہ اس خواب سے بیدار نہ ہونے پائیں۔ بدقسمتی سے خود ہمارے ہاں کے اکثر مصنفین بھی اسی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ لیکن جب ایک نوجوان طالب علم کو بتایا جاتا ہے کہ دین کا مغز تصوف ہے اور (SAINTS) کا مقام سب سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ پھر عیسائیوں کے (SAINTS) اور ہندوؤں کے (SAINTS) اور بدھوں کے (SAINTS) کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ (SAINT) بہرحال (SAINT) ہوتا ہے خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو۔ بدھ ہو یا مسلمان۔ وہ کون سی بات ہے جس میں ایک مسلمان (SAINT) کو غیر مسلم (SAINT) پر فوقیت حاصل ہوتی ہے (SAINT) کا کمال اس کی کرامات ہیں اور کرامات ہر مذہب کے (SAINT) کے ہاں پائی جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! میرے پاس وقت نہیں کہ میں تصوف اور ولایت کے اس تصور کو آپ کے سامنے تفصیلاً پیش کروں۔ سردست میں اس سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے ایک قول پر اکتفا کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ

"تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے"

ایک مورخ آپ کو بتائے گا کہ تصوف کا یہ مجوسی شاہکار کتنی قوموں کے سفینے ڈبو چکا ہے۔

صاحب صدر! میں نے ایک طالب علم کی اس ذہنی کشمکش اور قلبی پریشانی کا مختصر سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو مذہب کے میدان میں اس کے لئے وجہ سوہانِ روح ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ ہمارے نوجوانوں کی یہ مشکلات بجا اور درست۔ لیکن اس کی ذمہ داری ہر فرد پر الگ الگ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے آپ فیصلہ کرے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جس طرح جی چاہے ان امور پر تنقید کرے، اعتراضات کرے اور اس کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھکے اسے قبول کرلے۔ جس سے اس کی طبیعت ابا کرے اسے مسترد کر دے۔ یہ درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس مذہب زدہ سوسائٹی میں ہمارا نوجوان زندگی بسر کرتا ہے اس میں وہ اس کی جرأت نہیں پاتا کہ وہ ان باتوں کو زبان پر لائے۔ وہ جانتا ہے کہ مذہبی جنون اس کے خلاف کیا کرے گا! لیکن اس کی خاموشی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ دل سے مذہب کا قائل ہے۔ اس کے دل میں شک و شبہ کی کوئی چبھن نہیں رہی۔

انفرادی ذمہ داری

لیکن تصویر کا ابھی ایک رخ اور بھی باقی ہے۔ کہا جاتا ہے ـــــ اور ایسا کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ نوعِ انسانی کی ساری تاریخ اس کوشش کی داستان ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے کس طرح راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ان اقوام کے سلسلے میں اور بھی سچی ثابت ہوتی ہے جو آمادہ بہ زوال ہوں یا جن میں لیڈرشپ جوشِ کردار سے عاری ہو۔ یا جن کے سامنے زندگی کی کوئی بلند اقدار نہ ہوں۔ ان قوموں میں تقدیر کا مسئلہ، راضی بہ رضا رہنے کا غلط تصور، منتوں اور نیازوں سے کامیابی حاصل کرنے کا عقیدہ، بزرگوں کے مزاروں سے مرادیں مانگنے کا مسلک، صدقہ میں جانور ذبح کر کے مصائب و خطرات سے محفوظ ہو جانے کا تصور، تعویذ ناگے سے مقاصد حاصل کرنے کا نظریہ۔ غرضیکہ اس قسم کے تمام عقاید و نظریات جن میں انسان کشمکشِ حیات سے بچنے کے لئے خود فریبی میں پناہیں ڈھونڈتے، عام ہو جاتے ہیں۔ قوم کی انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ مذہب کی غلط تعلیم نے ہمارے نوجوان طبقہ میں بھی اسی راہِ فرار کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ جمعرات کی شام کو لاہور کے نواح میں مختلف مزاروں پر عوام اور جہلا کی بھیڑ کے ساتھ آپ کو طالب علموں کا ہجوم بھی دکھائی دے گا۔ ان کی محفلوں میں تقدیر، یعنی قسمت کے مسئلہ پر اکثر بحث ہو گی۔ اور ان کی طبیعت کا رجحان ہمیشہ اس طرف نظر آئے گا کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ محنت اور ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار کرنے والے انسان کو اس قسم کے عقائد سے جس قدر مرگ آفریں سکون ملتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ اپنے پاؤں چلنے کی کوشش نہ کرنے والے کو دوسروں کے سہاروں سے جس قدر فریب انگیز اطمینان ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا نوجوان طالب العلم ان سہاروں کا عادی ہو رہا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہ اس قسم کے عقائد اور اعمال سے، سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایک مغرب زدہ، مادہ پرست نوجوان، ہر ایک کی نگاہوں

حصولِ عزت

میں مطعون قرار پاتا ہے۔ سوسائٹی اسے مجرم تصور کرتی ہے۔ لیکن اسے معاشرہ کی نگاہوں میں عزت کا مقام حاصل کرنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ داتا صاحبؒ کے مزار پہ جانا شروع کر دے یا اپنے گلے میں ایک عدد تعویذ لٹکا لے یا ڈاڑھی بڑھا لے۔ اس نے یہ کیا اور اس کے تمام عیوب، جو اس سے پہلے سوسائٹی کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے، ایک دم نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ بڑا شریف۔ صالح نوجوان قرار پا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب عزت ایسی آسان اور سستی ملتی ہو تو اسے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے؟

کیا سے کیا بن گیا؟

یہ ہے خواتین و حضرات، ایک پاکستانی طالب علم کا نقشہ۔ ذرا سوچئے کہ اس نے کیا بننا تھا اور ہم نے اسے کیا بنا دیا؟ وہ جو دنیا میں آیا تو اس طرح کہ نہ اس کے کندھے پر اولیں ماں باپ کے کسی گناہ کا بوجھ تھا اور نہ ہی کسی پچھلے جنم کے پاپ کا پشتارہ۔ اس کے برعکس وہ مضمر صلاحیتوں کی ایک دنیا اپنے آغوش میں لے کر آیا تھا ـــ سوچئے کہ ہم نے ایسے درخشندہ ممکنات کے حامل نوجوانوں کو کیا بنا دیا؟ ـــ ایک ایسا فرد جو ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ جو محنت سے جی چرا کر موہوم سہاروں میں پناہ ڈھونڈتا ہے جو اپنے آپ کو فریب دیتا اور منافقت کی زندگی جیتا ہے۔ جو معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کی آسان راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس کا سینہ مذہب کے خلاف شکوک و شبہات اور تنقید و تعریض کی آماجگاہ بنا رہتا ہے لیکن دوسروں کو وہ نہ اندھا پرست دکھائی دیتا ہے۔ وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے الفاظ میں اپنے اور اپنے ہم عصر ان دیگر طالب علموں کے متعلق کہہ سکتا ہے کہ

> ہم وہ ہیں جو اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔
> لیکن ہم میں خس و خاشاک ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہے۔
> ہم ایسی گڑیاں ہیں جو ایک دوسرے کے سہارے کھڑی ہیں۔
> لیکن جن کے دماغ میں بھُس بھری ہوئی ہے۔

ہاں ہم نے اپنے طالب علموں کو یہ کچھ بنا دیا ہے ـــ وہ طالب علم جنہوں نے تحریک پاکستان کی بنیادوں پر ذمہ دار جفاکش دیانتدار۔ آزاد اور با عزت شہری بننا تھا ـــ ہمیں جنہوں نے تخلیق خداوندی کا شاہکار قرار پانا تھا انہیں ہم نے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔

مجھے خواتین و حضرات! اپنی تقریر کو یہیں ختم کر دینا تھا۔ لیکن میں اسے یوں ختم نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے کہ

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں

اس میں مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے اور مایوسی زوالِ علم و عرفان ہے۔ ایک معلّمہ کی حیثیت سے میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتی ہوں۔ کسی وسیع و عظیم عملی تجربہ کے نتائج کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے ذاتی محدود تجربہ کے نتائج کی بنا پر۔ کہ پاکستان کے طالب علم وہ کچھ بنائے جا سکتے ہیں جو

کچھ انہوں نے تحریک پاکستان کی بنیادوں پر بنتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ (i) اسلام، مذاہب عالم میں سے ایک مذہب نہیں، یہ دین ہے۔ یہ نظام حیات ہے۔ اسے عقلی اور فکری طور پر سمجھنا اور دل کی پوری رضامندی سے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرنا چاہیئے۔ اور جس بات سے تمہارا دل مطمئن نہ ہو اسے کبھی تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔

(ii) اس دین کا سرچشمہ قرآن کریم ہے جو ہمیں ایسی مستقل اقدار دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار، دین کے ناقابل تغیر اصول ہیں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

جب اُنہیں یہ بتایا جاتا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی پیشانی اس کے دل کے اطمینان کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ وہ جب نگہ تصور سے دیکھتا ہے کہ توہم پرستی۔ اندھی تقلید، خلاف علم و عقل معتقدات۔ بے معنی رسومات۔ مردہ قوانین اور بے جان روایات کے وہ بت جو صدیوں سے مذہب کی پرستش گاہ میں براجمان تھے اور جن کے حضور جھکنے پر اسے مجبور کیا جاتا تھا، ایک ایک کرکے اپنے استھانوں سے نیچے گر رہے ہیں تو وہ ایک ایسے انسان کی طرح جس کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہوں، اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اس کے سامنے نئی امیدوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ اپنے مستقبل کو پوری خود اعتمادی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ اور اسے ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے عزم راسخ سے آگے بڑھتا ہے۔ یہ کچھ اُسے قرآن کی اس تعلیم سے حاصل ہو سکتا ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے اور جس طرح میں نے شروع میں کہا ہے، آخر میں بھی اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر بلاخوف تردید کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت تحریک طلوع اسلام ہی ایسی تحریک ہے جو ہمارے نوجوان طلبا کی مذہبی مشکلات کا حل پیش کرکے ان کی دنیا اور قوم کا مستقبل بدل سکتی ہے۔ والسلام۔

بقیہ از صفحہ ۱۴۴ (بچوں کی تربیت گاہ)

قائد اعظم نے جو پاکستان بننے کے بعد کہا تھا کہ کام کرو۔ کام کرو۔ کام کرو۔ وہ صرف مردوں سے ہی خطاب نہ تھا بلکہ عورتیں اور مرد دونوں اس میں شامل تھے۔

الغرض ایک ماں کو نہ صرف بچوں کو تعلیم دینی ہوتی ہے اور ان کو زندگی کی اقدار سے آگاہ کرنا ہوتا ہے بلکہ جہاں تک ہو سکے ان اقدار اور ان اصولوں کو ان کے سامنے عملی اور مثالی طور پر بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربہ ہے ایک ایسی ماں کا جو کالج تو ایک طرف کسی مڈل اسکول میں بھی داخل نہیں ہوئی۔ لیکن اس کی اپنی تربیت علم اور بصیرت کے ماحول میں ہوئی اور اسی قسم کے ماحول میں اس نے اپنے بچوں کی تربیت کی۔ اس تربیت کی دو مثالیں تو ابھی ابھی آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ یعنی شمیم اور زاہدہ۔ اللہ انہیں ہمیشہ علم اور بصیرت کی روشنی میں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہی ایک ماں کی سب سے بڑی آرزو ہو سکتی ہے۔ والسلام

باب سوم

والدین کی نمائندگی

میرزا محمد خلیل صاحب (لاہور)

ہمارے نوجوانوں کے مسائل

(ایک باپ کے تجربات اور تاثرات)

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز!

آپ کے اس مذاکرہ میں جو میرے خیال میں اپنی نوعیت کا منفرد اجتماع ہے۔ "والدین کی نمائندگی" کی سعادت میرے حصہ میں آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلبا کی نمائندگی اور اساتذہ کی نمائندگی کی نسبت والدین کی نمائندگی ذرا مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ طلبا اور اساتذہ کے تجربات قریب قریب مشترک ہوتے ہیں۔ لیکن ایک باپ کو صرف اپنے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے تجربات دوسرے اشخاص سے مختلف ہوں۔ میں بہرحال کوشش کروں گا کہ اپنے ایسے تجربات بیان کروں جو بڑی حد تک مشترک کہلا سکیں۔ اس باب میں البتہ ایک بات میرے لئے آسانی کا موجب بھی ہے اور وہ یہ کہ میرے ان تجربات کا میدان قدرے وسیع ہے۔

میرے دو بچے تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کر رہے ہیں۔ ان سے چھوٹے دو۔ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان سے چھوٹے ابھی اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں یا اب اسکول سے کالج میں جانے والے ہیں۔

برادرانِ عزیز! میرا شروع سے انداز یہ رہا ہے کہ میں گھر کی زندگی میں بچوں کو قرآنی تعلیم کے سہل گوشے جو ان کی استعداد کے مطابق ہوں عقل و فکر کی روشنی میں سمجھاتا رہتا ہوں۔ اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار رہا۔ لیکن میری مشکلات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ایک دن ایک بچے نے اسکول سے آکر کہا کہ ابا جان! آپ تو کہتے ہیں کہ ہماری زمین گھومتی ہے اور اس طرح جب ہم سورج کے سامنے آتے ہیں تو دن چڑھتا ہے اور جب اس سے دوسری طرف ہو جاتے ہیں تو رات پڑ جاتی ہے۔ اے آپ نے گلوب اور لیمپ کی مثال سے سمجھایا بھی تھا۔ لیکن آج ہمارے دینیات کے استاد نے بتایا ہے کہ رات کے وقت سورج اللہ میاں

کے عرش کے نیچے جا چھپتا ہے اس لئے رات پڑ جاتی ہے۔ اور دوسری صبح اسے فرشتے وہاں سے نکالتے ہیں پھر دن چڑھتا ہے۔

یہاں سے ان مشکلات کی ابتدا ہوئی اور پھر یہ بچوں کے پورے کے پورے عرصۂ تعلیم میں ساتھ رہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ باوجود ایسے مقامات پر رہائش پذیر ہونے کے جہاں انگریزی یا یورپین طرز کے اسکول بھی موجود تھے میں نے اپنی صوابدید کے مطابق اپنے بچوں کو بالعموم اسلامیہ اسکولوں میں ہی تعلیم دلائی۔ بہر حال بچے نت نئے دن ایک نیا مسئلہ لے آتے کہ آج مولوی صاحب نے یہ بتایا ہے اور آج وہ بتایا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کچھ قرآن کے بھی خلاف ہوتا اور علم و عقل کے بھی۔ مشکل یہ تھی کہ اگر میں یہ سب کچھ سن کر چپ رہتا ہوں تو بچوں کے دل میں شروع سے یہی توہم پرستی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور انسان کی زندگی کی عمارت ان بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ جو علم اور قرآن دونوں کے خلاف ہیں۔ اگر اس کی تردید کرتا ہوں تو بچوں کی اسکول میں شامت آجاتی ہے۔ وہاں مولوی صاحب سے پٹتے ہیں اور سب سے بڑا نقص یہ کہ ان کے دل میں ایک نفسیاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جسے میں کبھی پیدا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ یہ مشکل امتحان کے دنوں میں سخت تر ہو جاتی۔ بچے پوچھتے کہ دینیات کے پرچے میں جو سوال پوچھے جائیں۔ ان کے وہ جواب دئے جائیں جو نصاب کی کتاب میں لکھے ہیں۔ اور مولوی صاحب نے بتائے ہیں یا وہ جواب جو آپ نے بتائے ہیں اور جنہیں ہم ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ جواب وہ دو جنہیں تم ٹھیک سمجھتے ہو تو وہ امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں اگر کہتا ہوں کہ جواب وہ دو جو تمہیں اسکول میں پڑھائے گئے ہیں خواہ تم انہیں غلط ہی کیوں نہ سمجھتے ہو تاکہ تم پاس ہو جاؤ تو بچوں کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اگر غلط بات کہنے سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے تو ٹھیک بات کو چھپا کر غلط بات کہہ دینی چاہیئے۔

سوچئے برادرانِ عزیز! یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہے جس میں سے ایک فرض شناس باپ کو گزرنا پڑتا ہے اور کس قدر خطرناک راستہ ہے جو ایک بچے کو طے کرنا پڑتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس سے بیشتر بچے ایک ایسی نفسیاتی الجھن یعنی (PSYCHOLOGICAL COMPLEX) میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس سے وہ عمر بھر نکل ہی نہیں پاتے۔ اور جو ان کے جوہر انسانیت کو بُری طرح تباہ کر جاتا ہے۔

میری دوسری مشکل کی نوعیت ذرا مختلف تھی لیکن وہ اس پہلی مشکل سے بھی زیادہ صبر آزما تھی۔ اس مشکل کے میدان دو تھے۔ ایک وہ ماحول جس میں بچے رہتے تھے دوسرا اسکول یا کالج کا ماحول۔ جس میں وہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہم سرکاری ملازمین کی رہائش بالعموم ایسی ہوتی ہے کہ ہمیں کسی گورنمنٹ کالونی میں کوئی مکان ملتا ہے یہ کالونی وہ ماحول پیدا کرتی ہے جس میں ہمارے بچے پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن کالونی میں حالت یہ ہوتی ہے کہ ایک مکان میں ایک ایسا شخص رہتا ہے کہ جس کی تنخواہ (مثلاً) پانچ سات سو روپے ہے تو ساتھ والے مکان میں ایسے صاحب رہتے ہیں جو ڈیڑھ دو ہزار پاتے ہیں ان کی آمدنی میں تفاوت اس قدر ہوتا ہے لیکن ان سب کے بچے ایک ہی جگہ اٹھتے بیٹھتے ہیں ایک ہی جگہ کھیلتے کودتے ہیں۔ اور ایک ہی اسکول یا کالج میں پڑھنے جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلا کر اپنے بچوں کا معیارِ زیست ان بچوں

سے کمتر رکھتے ہیں جن کے والد زیادہ تنخواہ پاتے ہیں تو ہمارے بچوں کے دل میں شروع ہی سے احساسِ کمتری کی ابتدا ہو جاتی ہے
اس احساس کی تصویر مجھ سے پہلے ایک عزیز طالب العلم نے نہایت عمدگی سے آپ کے سامنے پیش کی ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے اگر ہم اپنے بچوں کا معیارِ زندگی بلند کرتے ہیں تو اس کا اثر باقی ضروریاتِ زندگی پر پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات معیشت میں عدم توازن سے یہ نوبت قرض تک جا پہنچتی ہے "غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را"۔
یہی مشکل اسکول یا کالج کے اندر بھی جاری رہتی ہے جہاں مختلف طبقات کے خاندان کے بچے ایک ہی جگہ رہتے ہیں اور تعلیم پاتے ہیں۔ بچوں کے ان احساسات کا جو نتیجہ ان کی اگلی زندگی میں جاکر سامنے آتا ہے۔ ہمارے معاشرہ کی بیشتر ناہمواریوں کا باعث وہی ہے۔

اس مشکل کی ایک نوعیت اور ہے اور اس کا تعلق بھی بیشتر ملازم پیشہ طبقہ سے ہے۔ زندگی جوں جوں آگے بڑھتی ہے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بچوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے اور ان کی پرورش اور تعلیم کے اخراجات بھی دن بدن بیش از پیش ہوتے جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ملازم سرکار کی آمدنی میں اضافہ اسی نسبت سے کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی تنخواہ کے اسکیل کی رُو سے سال کے بعد پانچ دس یا زیادہ سے زیادہ بیس پچیس روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات تو ایسی مشکل بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس تنخواہ میں برسہا برس تک اضافہ ہوتا ہی نہیں۔ ان حالات میں ایک ذمہ دار باپ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لمحات مجھے عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ جب بچے امتحان کا نتیجہ نکلنے پر خوشی سے اچھلتے کودتے گھر آتے ہیں اور اپنے پاس ہونے کے اعلان سے محلہ بھر کو سر پر اٹھا لیتے۔ بچوں کی کامیابی کی خوشی کسے نہیں ہوتی لیکن میں اس سے ایک گہری سوچ میں پڑ جاتا کہ کل ہی سے اخراجات دُگنے ہو جائیں گے اور آمدنی وہی کی وہی رہے گی۔

سوچئے عزیزانِ گرامی! کہ ایک باپ جس نے پانچ سات بچوں کی اس طرح بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنا ہو۔ اس کی زندگی کی راہیں کس کشمکش میں گزرتی ہیں۔

جب بچے (کالج کے زمانے میں) جوان ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کے لئے ایک اور نوعیت کی مشکل کا سامنا ہو جاتا ہے۔ ہمارا زمانہ عصرِ رفتار (AGE OF SPEED) کہلاتا ہے۔ اس میں اور اس سے ذرا ہی پہلے کے زمانے میں وہی فرق ہے جو فرق بیل گاڑی اور (BOEING JET) کے سفر میں ہے۔ چنانچہ اب زمانے کے تقاضے اس تیز رفتاری سے بدلتے رہتے ہیں کہ ایک باپ اور اس کے جوان بیٹے کی زندگی میں بہت بڑا بُعد پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ عمر کے اعتبار سے ان میں بیس پچیس سال ہی کا فرق ہوتا ہے۔ ان دونوں کے تقاضے مختلف اور پیمانے الگ الگ ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ باپ بیٹوں کے تقاضوں سے واقف ہوتا ہے نہ بیٹا باپ کی تمناؤں سے باخبر۔ چنانچہ یہ شاہراہِ حیات پر ایک دوسرے کے رفیقِ سفر نہیں رہتے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو اپنا حلیف سمجھتا ہے۔ بلکہ

دیکھئے! جس دن آپ کے جوان بیٹے نے آپ کو دور سے آتا دیکھ کر اپنا سگریٹ بجھا دیا۔ سمجھ لیجئے کہ آپ میں اور اس میں ایک بُعد پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ ایک نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL CONFLICT) کی ابتدا ہو گئی جو خدا معلوم اسے کہاں لے جائے اور آپ کو کہاں؟ میرے نزدیک ایک باپ کی زندگی میں یہ مرحلہ نازک ترین اور سخت ترین ہوتا ہے اس میں سے صحیح وسلامت گزر جانا کمالِ ہے دانش۔ باپ اور بیٹے کی یہ کشمکش بعض اوقات کھلی ہوئی سرکشی کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ یہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے لیکن اسے ظاہرداری کے تعلقات رکھ رکھاؤ اور معاشرے کے خوف یا اعصابی کمزوری کی وجہ سے پیدا شدہ "جذبۂ حُسنِ اخلاق اور ادب واحترام" کے پردوں میں چھپا دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر جب یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے تو یہ بیٹے اور باپ دونوں کے متاعِ امن وسکون کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

اس سے کچھ مختلف قسم کی مشکل کا سامنا اس باپ کو کرنا پڑتا ہے جو اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری (INVESTMENT) ہے جو مجھے آگے چل کر منافع کے ساتھ کئی گنا ہو کر واپس ملے گی۔ اس کی یہ توقعات عام طور پر صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔ اکثر اوقات اس لئے کہ جوان ہونے کے بعد ان بیٹوں کے اپنے گھر کے اخراجات اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ وہ والدین کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی عجیب وغریب الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ گوشہ شاید ہمارے پیشِ نظر موضوع سے غیر متعلق ہے اس لئے میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز! میرے نزدیک ہمارے دور کے والدین کی عمومی مشکلات جو انہیں بچوں کے ضمن میں پیش آتی ہیں۔ ان مشکلات کا اطمینان بخش حل تو قرآنی معاشرے کے اندر ہی مل سکتا ہے جس میں پورے کا پورا ماحول اس طرح بدل جاتا ہے کہ اس میں باہمی آویزش اور کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جب تک ایسا نہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ اگر بچوں کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان کے سامنے قرآن کی مستقل اقدار کا تصور آجائے اگر ہو جائے تو ان مشکلات میں بڑی حد تک آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن قرآنی اقدار کا تصور زبانی وعظ ونصیحت سے آجاتا اگر نہیں ہوتا یہ تو باپ کی عملی زندگی ہی سے سامنے آسکتا ہے اور یہی مرحلہ سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بدترین دوزخ کی زندگی ان گھرانوں کی ہوتی ہے جن میں بچوں کو وعظ ونصیحت بہت زیادہ کیا جائے لیکن وعظ ونصیحت کرنے والے ماں باپ کی اپنی زندگی اس سے مختلف ہو۔ اس سے وہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں جن کا حل کوئی نہیں۔ وماھم بخارجین من النار۔
یہ ہیں برادرانِ عزیز! میرے نزدیک ہمارے دور میں والدین کی چند ایک مشکلات۔ باقی رہا ان کا علاج سو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی ——— اور یہی وہ آبِ نشاط انگیز ہے جو ہمیں یہاں ملتا ہے۔

والسّلام۔

محترمہ بہن حمیدہ بیگم۔ لاہور

بچوں کی تربیت گاہ

(ایک ماں کے تاثرات)

بچہ پیدا ہونے کے بعد ایک ماں پر کیا کیا ذمہ داریاں اور فرائض عائد ہو جاتے ہیں ایک سمجھدار ماں ہی اس کو سمجھ سکتی ہے۔ بچہ جو کچھ گھر میں دیکھتا ہے وہی سیکھتا ہے۔ بچے کا پورا کردار ماں ہی بناتی ہے۔ ہمارے اپنے ہی خاندان میں کئی مثالیں موجود ہیں کہ جہاں ماں سمجھدار، دور اندیش ہے بچے نہایت اچھے کردار کے ہیں۔ اور جہاں مائیں خود تربیت یافتہ نہیں وہاں باپ خواہ کتنے ہی اچھے اخلاق کا کیوں نہ ہو مگر ماں کی وجہ سے بچوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے ان میں صحیح اخلاق پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ بچہ ۲۴ گھنٹے ماں کی نگرانی میں رہتا ہے وہ جو کچھ ماں کو کرتے دیکھتا ہے وہی سیکھتا ہے اس کے برعکس باپ صبح کا گیا شام کو گھر آتا ہے اس کو بچوں کی تربیت میں کوئی خاص دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے میں تو کھلے بندوں کہوں گی کہ بچوں کو بنانے والی ماں ہی ہے۔ اچھے یا بُرے۔ کاش ہر ماں اس اہم ذمہ داری کو سمجھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم بڑی چیز ہے لیکن گھر کا ماحول اور تربیت اچھی ہو تو تعلیم بھی تب ہی فائدہ دے سکتی ہے۔

میں آپ کے سامنے اپنے والدین کی مثال پیش کرتی ہوں۔ میرے ابا جان مرحوم نہایت ہی روشن خیال، بلند کردار اور ایک سچے دیانتدار انسان تھے۔ ان کی روشن خیالی کا یہ عالم تھا کہ ۴۰ سال پہلے جب کہ مسلمانوں میں پردے کی بڑی سخت پابندی تھی، وہ کہا کرتے تھے کہ بیٹی! مروجہ پردہ تو عورتوں کے خلاف مردوں کے انتقام کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس بیجا قسم کے پردے نے جو کہ فطری قانون کے بھی خلاف ہے ہماری بہو بیٹیوں کو بالکل معذور کر کے بٹھا دیا ہے۔ اس قسم کے دم گھونٹ دینے والے پردہ میں عورتیں کبھی بلند حوصلہ ہو ہی نہیں سکتیں۔

ابا جان کو بڑھاپے تک علم حاصل کرنے کا ایک جنون تھا۔ ریٹائرڈ ہونے سے دو سال بیشتر انہوں نے دو ماہ کی چھٹی لے کر لغات عرب پڑھنی شروع کی اور اس قلیل مدت میں خدا جانے انہوں نے اس کتاب کی کتنی موٹی موٹی جلدیں ختم کر ڈالیں اور اس کتاب کے خاص خاص حصے ہمیں بھی پڑھ کر سنائے۔

دراصل میرے ابا جان نے جس وقت ہوش سنبھالا وہ سرسید احمد خاں کا دور تھا۔ ابا جان بتایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ سرسید چندہ جمع کرنے لدھیانہ میں تشریف لائے۔ ابا جان کی عمر اس وقت غالباً ۱۸ سال کی تھی۔ ہوشیارپور میں ملازم تھے۔ وہاں کے اچھے تعلیم یافتہ گھرانوں سے ان کی میل ملاقات تھی۔ ابا جان ۶ سو روپیہ چندہ جمع کر کے لدھیانہ پہنچے۔ اور روپوں کی تھیلی سرسید احمد خان کے سامنے رکھ دی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میرے ابا جان کو گلے لگا کر کہا کہ اگر میری قوم کا ہر جوان آپ کی طرح اس فرض اور اس کی اہمیت کو سمجھ لے تو میرا کالج چند دنوں کے اندر تیار ہو جائے۔ ابا جان کو سرسید سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب بھی سرسید کا نام ان کی زبان پر آتا آنکھوں سے اشکوں کا دریا بہنے لگتا۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ جب سرسید کا انتقال ہوا تو تمہارے ابا جان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ کسی بیٹے کو اپنے پیارے باپ کا بھی اتنا صدمہ نہ ہوا ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید جیسے سچے مومن مرد مجاہد ہی پہلے گھروں کے اندر اور اس کے بعد قوموں کے اندر انقلاب لے آتے ہیں۔

میں نے ایسے گھر میں پرورش پائی جہاں امی اور ابا دونوں کی رگ رگ میں سرسید کی تعلیم بسی ہوئی تھی۔ امی اور ابا کی ہم آہنگی کی وجہ سے گھر جنت کا نمونہ تھا۔ فرصت کا تمام وقت امی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتیں۔ سرسید کی کتابیں۔ مولانا حالی کی کتابیں۔ پھر مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی کی کتابیں۔ مسدس حالی۔ بیوہ کی مناجات۔ ان کو سب زبانی یاد تھیں۔ کسی پیر فقیر کی نذر و نیاز۔ یا تعویذ گنڈے۔ ختم۔ فاتحہ وغیرہ قسم کی چیزیں ہمارے ہاں قطعاً کبھی نہیں ہوئیں۔ یہ سب کیا تھا قرآن کی صحیح تعلیم کا اثر تھا۔

ابا جان! امی کے انتقال کے بعد بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ آپ کی امی کے ۳۷ سالہ ساتھ میں کبھی ایک منٹ کے لیے بھی شکر رنجی تک نہیں ہوئی۔ شادی ہوئی تو خوش قسمتی سے شوہر بھی ایسا ملا جسے علم کا بے حد شوق تھا۔ ان کی دلچسپیاں صرف گھر اور دفتر تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ ملک کے سیاسی حالات اور قومی تحریکوں میں بھی کافی حصہ لیتے تھے۔ مجھے شادی کے بعد شوہر کی طرف سے جو پہلا تحفہ ملا، وہ کھدی کے بنے ہوئے کھدر کا ایک جوڑا تھا۔ جو بڑی خوشی سے میں نے قبول کیا۔ اور اس کو خوب پہنا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ کھدر باریک اور ملائم تھا۔ جب طلوع اسلام جاری ہوا تو اس کا پہلا پرچہ ہمارے گھر میں آیا۔ ہمارے محترم اور میرے عزیز بھائی پرویز صاحب شملہ اور دہلی سے ہمیں پمفلٹ بھجوایا کرتے تھے کہ بلا قیمت ان کو بانٹ دو۔ ہم دونوں فی پمفلٹ ایک آنہ میں قیمت لے کر ان کو تقسیم کر دیتے اور روپے جمع کر کے دفتر طلوع اسلام میں بھجوا دیتے۔ میرے بچوں نے شروع سے گھر میں اس قسم کا ماحول دیکھا۔ جو بات ان کو سمجھائی گئی عقل کی دلیل سے سمجھائی گئی۔ گھر کی جیسی فضا ہو گی بچے وہی کچھ بن جائیں گے۔

اردو اور قرآن کی تعلیم تھوڑی بہت میں نے بچوں کو گھر میں دی۔ بمبئی میں میرے تینوں بچے کانونٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔ مجھے اس وقت بڑی بچی کا ایک واقعہ یاد آگیا جو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ بچی اس وقت تھرڈ سٹینڈرڈ میں پڑھتی تھی۔

ان اسکولوں میں بائبل ضرور پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں ذکر آیا کہ عیسیٰؑ خدا کا بیٹا ہے اور مریمؑ خدا کی ماں۔ یہ بچی فوراً کھڑی ہوکر بولی۔ عیسیٰؑ خدا کا بیٹا نہیں۔ بیٹا خدا کا رسول ہے۔ اور مریمؑ خدا کی ماں نہیں بلکہ ایک نبی کی ماں ہے۔ ٹیچر بھنا گئی اور کڑک کر کہنے لگی کہ تم کو یہ کس نے بتایا کہ عیسیٰؑ خدا کا نبی ہے۔ اس نے دھڑلے سے جواب دیا۔ ہمارے قرآن نے۔ ٹیچر کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ کہنے لگی۔ کیا تم یہاں قرآن پڑھانے آئی ہو۔ جو ہم کہتے ہیں وہ تمہیں کہنا پڑے گا۔ بچی نے جواب دیا میں غلط بات ہرگز نہیں کہوں گی۔ ٹیچر نے سخت غصے کی حالت میں کہا کہ میں تمہارے امتحان میں نمبر کاٹ لوں گی۔ اس بچی نے دلیری سے جواب دیا۔ نمبر چھوڑ مجھے فیل بھی کردو تو پرواہ نہیں۔ دیکھئے سچائی بچوں میں بھی کتنی جرأت پیدا کردیتی ہے۔ گھر آکر جب اس نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے خوب شاباشی دی (یہ بچی وہی ہے جو ابھی ابھی آپ کے سامنے انگریزی میں تقریر کرکے گئی ہے۔۔۔۔۔ یعنی نسیم انور۔ کینرڈ کالج کی لیکچرار)۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کرتے جاؤ۔ مگر ان سے ہر وقت یہ نہ کہتے رہو کہ تم یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہاں نہ جاؤ۔ اس سے نہ ملو۔ انہیں خطرات سے آگاہ کردو اور اس کے بعد خود سوچنے سمجھنے کا موقع دو بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ جوان اولاد کے ساتھ بالکل دوستانہ برتاؤ کرو۔ ہر کام میں ان سے مشورہ لو۔ بچے میں جب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو اس طرح بچے خود ہی کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ان سب باتوں کے ساتھ بچوں کی خوراک، لباس، صحت کا خیال رکھنا بھی بڑا ضروری ہے۔ متوسط گھرانے کی ماں کو تو سارے کام خود ہی انجام دینے پڑتے ہیں۔ وہ بچوں کی آیا بھی ہوتی ہے۔ دھوبن بھی۔ باورچن بھی۔ درزن بھی۔ اس کے لئے ماؤں کو بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بچے آیا کے سپرد کرنے ہی نہیں چاہئیں۔ یہ میں نہیں کہتی کہ آیا یا نوکر رکھو ہی نہیں ضرور رکھو۔ مگر بچے کے سب کام اپنی نگرانی میں کراؤ۔ اکثر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے کہ آیا اپنے آرام کے لئے بچوں کو افیون جیسی زہریلی چیز دے کر بہلا چھوڑتی ہیں۔ میرے بچے جب چھوٹے تھے، میں نے دن میں کبھی ایک منٹ کے لئے بھی آرام نہیں کیا۔ بڑے بچے اسکول میں چلے جاتے۔ چھوٹے سو جاتے۔ اور گھر کے کام کاج سے فارغ ہوکر سلائی یا بنائی کرتی رہتی۔ میں نے کبھی درزی کو سلائی کا ایک پیسہ نہیں دیا تھا۔ بچوں کے سب کام اپنی نگرانی میں کراتی۔ بچوں کا کھانا سکول اور ان کے ابا کا کھانا ہر روز دفتر جاتا تھا۔ بچے جب ذرا بڑے ہوگئے تو ان کا اپنا ہر کام انہی سے کرائی مثلاً وہ اپنے بستر خود کریں۔ اپنے بوٹ پالش خود کریں۔ چھٹی کے دن اپنے اپنے کپڑے دھوکر استری کریں۔ پیاس لگے تو بجائے نوکر کو آواز دینے کے خود پانی لیں۔ اس طرح بچوں کو کام کی عادت بھی پڑتی ہے۔ ماں کو بھی ذرا سہارا مل جاتا ہے۔ بچوں کی آئندہ زندگی پر بھی اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ میری بچیاں جب ذرا سیانی ہوگئیں۔ ایک دس سال کی دوسری آٹھ سال کی۔ تو ہفتے میں ایک بار شام کا کھانا میں ان سے پکواتی۔ ملازمہ چھوٹے بچوں کو لے کر باہر سیر کرنے چلی جاتی۔ اس دن شام کا سب کام یہ بچیاں خود کرتیں۔ اس طرح میری بچیاں تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری سے بھی پوری طرح واقف ہوگئیں۔

(باقی ص ۱۳۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

غلافِ کعبہ

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

پاکستان میں پچھلے دنوں، غلافِ کعبہ کی نمائش کی آڑ میں جو افسوسناک سیاسی کھیل کھیلا گیا ہے اس کے متعلق ہم نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس لئے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ملک میں ایسی جذباتی فضا پیدا کر دی گئی تھی جس میں یہ لوگ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اور جہاں تک سمجھدار طبقہ کا تعلق ہے، وہ جانتے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے۔ باقی رہے خود وہ حضرات جو اس تماشا کے ذمہ دار تھے، سو ان سے کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ وہ سب کچھ دانستہ کر رہے تھے — ان کے مسلک میں، اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کر لینا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہوتا ہے — لیکن، یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد، امیرِ جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے، اپنی ان حرکات کی مدافعت میں جو بیان شائع کیا ہے، اور ان کے جواز میں جو توجیہات پیش کی ہیں، ان سے صرفِ نظر کر لینا، ہمارے نزدیک، بارگاہِ خداوندی میں جرمِ عظیم ہے۔ اس لئے ہم، اس کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے بھی، کہ یہ تمام کھیل تماشا، وقتی ہنگامہ تھا جو ختم ہو چکا۔ اور ہمیں امید ہے کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ آئندہ اس قسم کی حرکات کی اجازت نہیں دے گا۔ لیکن جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے، وہ باقی رہے گا، اور، نہ جانے موجودہ، اور آنے والی نسلوں میں سے کتنے لوگوں کے لئے بدترین گمراہی کا موجب بنے گا۔ بنا بریں، ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھا جائے۔

دین کی بنیاد توحید پر ہے۔ قرآن کریم کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک طرف، شرک کے ہر جلی اور خفی راستے کو مسدود کر دیا — حتیٰ کہ ان ذرائع تک کو بھی ختم کر دیا جو ان راستوں کی طرف لے جانے کا موجب ہو سکتے ہیں — اور دوسری طرف، خدا کا ایسا بلند، پاکیزہ اور منزہ تصور دیا جو کسی اور جگہ نہیں ملتا۔ اس نے محسوسات کے خوگر انسان کو — جس کی جبینِ نیاز کے سجدے، حقیقت کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کے لئے تڑپتے رہتے تھے — ایک

ان دیکھے، غیر مرئی، غیر محسوس خدا کا تصور دیا۔ اس نے سارا دور خدا کی صفات پر دیا، اور اطاعت کے لئے اس کے احکام و قوانین پیش کر دیئے۔ جہاں تک ذات خداوندی کا تعلق ہے، اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶/۱۰۳) نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اس سے، اس نے خدا کے متعلق ہر محسوس تصور کی جڑ کاٹ دی۔ اس نے کہا کہ مشرک خدا کا منکر نہیں ہوتا۔ وہ غیر خدائی قوتوں کو خدائی صفات میں شریک یا ان کا مظہر مانتا ہے۔ وہ ان کو اس تعظیم و تکریم کا مستحق سمجھتا ہے جو صرف خدا کا حق ہے۔ وہ خدا کو محسوس پیکروں میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے محسوس ذرائع تراشتا ہے۔ قرآن نے انہی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹/۳) "ہم ان کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے مقرب بنا دیں گے"۔ انسان نے اپنے عہد جہالت میں شرک کی مختلف شکلیں وضع کر رکھی تھیں۔ قرآن نے ان تمام شکلوں کو ختم کر دیا، اور خدا کا منزہ تصور دے کر انسان کو ان تمام خرافات سے نجات دلا دی۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم توحید کے متعلق۔ اب آپ مودودی صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے جو ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی مارچ ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

> حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کی جڑ کاٹنے کے لئے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اظہار عبودیت کی جو جو صورتیں اس دنیا میں پائی جاتی ہیں اور انسانی فطرت پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضا کرتی ہے ان سب کو ہر دوسری جگہ ممنوع ٹھیرا دیا اور صرف ایک خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دے کر حکم دیدیا کہ ان سب صورتوں سے یہاں ہمارے حضور بندگی بجا لاؤ۔ اپنے معبود کے سامنے رکوع و سجود کرنا چاہتے ہو تو اس گھر کی طرف رخ کر کے جھکو۔ اور کسی چیز کے آگے نہ جھکو۔ طواف کرنا چاہتے ہو تو یہ ہمارا گھر ہے اس کا طواف کرو۔ کسی اور چیز کا طواف نہ کرو۔ آستانہ بوسی کرنا چاہتے ہو تو حجر اسود ہمارا سنگ آستاں ہے اسے چومو اور کسی دوسرے آستانے کو نہ چومو۔ معبود کی چوکھٹ سے چمٹ کر دعائیں کرنا چاہتے ہو تو ملتزم ہماری چوکھٹ ہے۔ اس سے لپٹو اور گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔ تیرتھ یاترا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لئے تیرتھ ہے۔ اس کی زیارت کے لئے دنیا بھر سے کھچ کھچ کر آؤ اور ہر دوسرے تیرتھ کی یاترا چھوڑ دو۔ اپنے معبود کی بارگاہ پر چادریں چڑھانا چاہتے ہو تو یہ ہماری بارگاہ ہے۔ چادر چڑھانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے یہاں چادر چڑھا کر اس کی تسکین کر لو اور پھر کسی دوسری جگہ چادریں

نہ چڑھاتے پھرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا میں ایک گھر کو اپنی طرف نسبتِ خاص دے کر پرستش کی ان ساری شکلوں کو جو مشرکین اپنے بناوٹی معبودوں کے لئے اختیار کرتے تھے ہر آستانے پر حرام کر دیا اور اہلِ توحید کو حکم دیا کہ وہ ساری شکلیں ہمارے اس آستانے پر برتی جائیں اور بس اسی جگہ کے لئے مختص رہیں۔ یوں خانہ کعبہ کا حکم ہر دوسرے مقام سے مختلف ہو گیا ہے۔ جو کچھ دوسری جگہ شرک ہے وہ یہاں توحید ہے (صفحہ ۲۹-۳۰)

(استغفراللہ۔ استغفراللہ)

آیئے، ذرا اس بیان کا تجزیہ کریں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ ان صاحب کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ انسان کی فطرت کچھ نہیں۔ "فطرت" ان تقاضوں کو کہا جاتا ہے جو کسی شے میں، خالقِ کائنات کی طرف سے رکھ دیئے جائیں اور جسے ان کے بدلنے کا اختیار نہ ہو۔ کسی شے کی "فطرت" بدل ہی نہیں سکتی۔ گرمی پہنچانا آگ کی فطرت ہے۔ آگ کو اس کا اختیار ہی نہیں کہ وہ اس میں تبدیلی پیدا کر دے اور گرمی پہنچانے کے بجائے ٹھنڈک پہنچانا شروع کر دے۔ نشیب کی طرف بہنا پانی کی فطرت ہے۔ اسے اس کا اختیار ہی نہیں کہ وہ بلندی کی طرف بہنے لگ جائے۔ پانی میں تیرنا مچھلی کی فطرت ہے، وہ خشکی میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ گوشت کھانا شیر کی فطرت ہے۔ وہ بھوکوں مر جائے گا لیکن گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ گھاس کھانا بکری کی فطرت ہے۔ وہ اپنی فطرت کے خلاف گوشت کے قریب تک نہیں جائیگی۔ فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں۔ اس کے اندر کچھ تو حیوانی جبلت کے تقاضے (INSTINCTS) ہیں۔ اور کچھ صلاحیتیں جنہیں نشوونما دے کر مناسب کام میں لانا، اس کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا حقیقت کے خلاف ہے کہ "انسانی فطرت پرستش کی بعض شکلوں کا تقاضا کرتی ہے"۔ یہ شکلیں قدیم زمانے کے انسان نے، جب اس کا ذہن عہدِ طفولیت میں تھا، وضع یا انتخاب کی تھیں اور اس کے بعد، اس میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آئیں۔ جو باتیں اس طرح متوارث چلی آئیں، انسان ان کا طبعی طور پر خوگر ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی "فطرت" کا تقاضا نہیں ہوتیں۔ اس کی متوارث عادت کا تقاضا ہوتی ہیں جنہیں بدلا جا سکتا ہے۔ وحیٔ خداوندی اسی قسم کے غلط تقاضوں کو بدلنے کے لئے آئی تھی۔

(۲) اس کے بعد آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ۔

انسانی فطرت، پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضا کرتی ہے ان سب کو دوسری جگہ ممنوع ٹھیرا دیا اور صرف ایک خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دے کر حکم دیدیا کہ ان سب صورتوں سے ہمارے حضور بندگی بجا لاؤ۔

آپ دنیا کی قوموں پر نگاہ ڈالئے اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ پرستش کی جو شکلیں ان کے ہاں رائج ہیں (اور جنہیں مودودی صاحب انسانی فطرت کا تقاضا بتاتے ہیں) ان میں ایک شکل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور وہ ہے بت پرستی یعنی اپنے معبود کو محسوس پیکر میں سامنے رکھ کر اس کی پرستش کرنا۔ اگر خدا نے یہ حکم دیا تھا کہ پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضا انسانی فطرت کرتی ہے، ان سب صورتوں سے ہمارے حضور بندگی بجالاؤ، تو کعبہ میں بت پرستی سب سے پہلے ہونی چاہیئے۔ حیرت ہے کہ خدا نے ایک طرف (بقول مودودی صاحب) یہ کہا کہ تم ان تمام شکلوں سے، جو تمہارے ہاں مروج چلی آرہی ہیں، ہمارے حضور بندگی بجالاؤ، اور دوسری طرف کعبہ سے بتوں کو نکال باہر کیا! اب فرمایئے کہ "فطرتِ انسانی" اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے یعنی خدا کو محسوس شکل میں سامنے رکھنے کے جذبہ کی تسکین کے لئے کہاں جائے؟ کیا انسان کو کعبہ میں بتوں کی پرستش سے منع کر دینا، خلافِ فطرت نہیں تھا؟ مودودی صاحب کو چاہیئے کہ کعبہ میں ایک بہت بڑا بت نصب کریں تاکہ لوگ اس شکل میں خدا کی پرستش کر سکیں جو بقول ان کے انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔

بُت ہی کیوں؟ لنگ کی پرستش بھی (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) تقاضائے فطرتِ انسانی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ کعبہ میں اس کا بھی انتظام فرمائیں۔ بلکہ کرنے کا کام تو یہ ہے کہ وہ، دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کریں اور قدیم قبائل میں پرستش کی جو جو شکلیں دیکھیں، انہیں کعبہ میں لاکر جمع کر دیں تاکہ وہاں اُن سب صورتوں کے لئے خدا کی پرستش ہو سکے جن کا تقاضا انسانی فطرت کرتی ہے۔ اور اس طرح (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) دین کی تکمیل ہو جائے!

(۳) بُت پرستی کے بعد آپ دیکھئے۔ دنیا کے مختلف قبائل اور اقوام میں، پرستش کے لئے ڈھول ڈھمکا، باجہ گاجا۔ ناچنا کودنا۔ تالیاں پیٹنا۔ سیٹیاں بجانا، قریب قریب ہر جگہ رائج نظر آئے گا۔ پرستش کی یہ شکلیں بھی (بقول مودودی صاحب) تقاضائے فطرتِ انسانی ہیں اس لئے انہیں بھی (اور جگہ ممنوع لیکن) کعبہ میں رائج ہونا چاہیئے۔ اسلام سے پہلے عرب یہ کچھ کرتے تھے — اور کعبہ ہی میں کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بھی منع کر دیا — بلکہ اسے کفر قرار دیا جب فرمایا کہ

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (۸/۳۵)۔

اور ان کی صلوٰۃ خانہ کعبہ کے نزدیک، سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے کچھ نہیں۔ سو تم عذاب کا مزہ چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے۔

ممکن ہے کہدیا جائے کہ وہ لوگ، یہ کچھ خدا کے حضور بندگی بجالانے کے لئے نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی ان حرکات کی مذمت کی گئی۔ اگر یہ بات تھی، تو مسلمانوں سے کہنا چاہیئے تھا کہ تم یہ سب کچھ کرو لیکن خدا کے حضور بندگی بجالانے

کے لئے کرو۔ یہ کیا کہ مسلمانوں کو، خدا کے حضور بندگی بجا لانے کی اُس شکل سے روک دیا جو انسانی فطرت کا تقاضا تھی اور جو کعبہ میں رائج چلی آ رہی تھی! مودودی صاحب کو چاہیئے کہ اس کی بھی اصلاح کر دیں۔

(۴) مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

(خدا نے حکم دیا کہ) تم اپنے معبود کے سامنے رکوع و سجود کرنا چاہتے ہو تو اس گھر کی طرف رخ کر کے جھکو۔ اور کسی دوسری چیز کے آگے نہ جھکو۔

آپ دیکھئے کہ اس مختصر سے ٹکڑے میں کس طرح خلط مبحث کیا گیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ

کعبہ کی طرف رخ کرنے ——— اور کعبہ کے آگے جھکنے

میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔ کعبہ کی طرف رُخ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ ان سب کا رخ ایک ہی طرف ہو۔ لیکن کعبہ کے آگے جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معبود سمجھا جائے۔ یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ یہ بُت پرستی ہے۔ کوئی مسلمان کعبہ کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ صرف اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اور یہی خدا کا حکم ہے۔ (اس کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔

(۵) اس کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

(خدا نے حکم دیا ہے کہ) آستانہ بوسی کرنا چاہتے ہو تو حجرِ اسود ہمارا سنگِ آستاں ہے۔ اسے چومو اور کسی دوسرے آستانے کو نہ چومو۔

معبود کی چوکھٹ سے چمٹ کر دعائیں کرنا چاہتے ہو تو ملتزم ہماری چوکھٹ ہے۔ اس سے لپٹو اور گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔

چادر چڑھانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے یہاں چادر چڑھا کر اس کی تسکین کر لو اور پھر کسی دوسری جگہ چادریں نہ چڑھاتے پھرو۔

کیا مودودی صاحب فرمائیں گے کہ خدا نے ان باتوں کا حکم کہاں دیا ہے؟ قرآن کریم میں (حکم تو ایک طرف) ان باتوں کا ذکر تک بھی کہیں نہیں ملتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب اپنے ایک غلط اقدام کو "عین اسلام" ثابت کرنے کے لئے، خدا کی طرف کیا کیا منسوب کرتے چلے جاتے ہیں، اور اس سے ذرا خوف نہیں کھاتے؟ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ۔ تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے احکام لکھتے ہیں اور ان کے متعلق مشہور یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ ایسا کچھ کیوں کرتے ہیں؟ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا "تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لیں۔ (۲/۷۹)۔

(۶) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

(خدا کا حکم ہے کہ تم) تیرتھ یاترا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لئے تیرتھ ہے۔ اس کی زیارت کے لئے دنیا بھر سے کھنچ کھنچ کر آؤ اور ہر دوسرے تیرتھ کی یاترا چھوڑ دو۔

یعنی، ان کے نزدیک، خدا نے حج کو "تیرتھ یاترا" بتایا ہے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ یہی مودودی صاحب، اس سے پہلے یہ فرما چکے ہیں کہ

(جب دین کا صحیح تصور مسلمانوں کے ذہن سے مٹ گیا تو....) حج کی حیثیت ہندوؤں کی یاترا اور عیسائیوں کے (PILGRIMAGE) سے زیادہ نہ رہی۔

(تفہیمات۔حصہ دوم۔صفحہ ۱۸۳)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

جاہلیت کے زمانے میں عربوں نے کعبہ کو عرب کا ہردوار یا بنارس بنا لیا۔ خود وہاں کے مہنت بن کر بیٹھ گئے۔ حج کو تیرتھ جاترا بنا کر اس گھر سے جو توحید کی تبلیغ کے لئے بنا تھا، بت پرستی کی تبلیغ کرنے لگے۔ (خطبات۔صفحہ ۱۹۸)۔

یعنی، ان کی تحقیق کے مطابق، عرب جاہلیت میں حج کی حیثیت محض تیرتھ جاترا کی رہ گئی تھی، اسلام نے آکر اس کی صحیح حیثیت متعین کی (جو تیرتھ جاترا کی نہیں تھی)۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اسے پھر تیرتھ جاترا میں تبدیل کر دیا، حتیٰ کہ حکومت حجاز کی کیفیت

بنارس اور ہردوار کے پنڈتوں کی سی ہو گئی ہے (ایضاً صفحہ ۲۲۵)

لیکن اب وہی مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ خدا نے حکم دیا تھا کہ تم تیرتھ جاترا کرنا چاہتے ہو، تو ہمارے گھر کی زیارت کرو۔ اور ہر دوسرے تیرتھ کی جاترا چھوڑ دو۔

(۷) اور آخر میں پھر وہی فقرہ سن لیجئے جسے ہم نے پہلے بھی سینے پر پتھر رکھ کر لکھا ہے اور جسے اب بھی دل پر جبر کر کے دُہراتے ہیں۔ یعنی

یوں خانۂ کعبہ کا حکم ہر دوسرے مقام سے مختلف ہو گیا ہے۔ جو کچھ دوسری جگہ شرک ہے وہ یہاں توحید ہے۔

ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ اس شخص کے متعلق کیا کہا جائے جس کا ایمان یہ ہو! اس سے بڑا جھوٹ، اس سے بڑا افترا، اس سے بڑا کفر، اس سے بڑا شرک کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ کیا اسلام کے بدترین دشمنوں نے اس سے بڑھ کر کوئی اور پروپیگنڈہ بھی اسلام کے خلاف کیا ہے؟ کیا دین کی میزان میں اس سے بڑا جرم کوئی اور بھی ہو سکتا ہے جو یہ کہا جائے

کہ جو چیز ہر دوسری جگہ شرک ہے وہ کعبہ میں پہنچ کر توحید ہو جاتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام، شرک کو مٹانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ صرف اس کے محلِ وقوع کو بدلنے کے لئے آیا تھا! وہ یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ جو کچھ تم ہر دوار میں کرتے ہو وہ شرک ہے۔ لیکن اگر وہی کچھ کعبہ میں جا کر کرو، تو وہ عین توحید ہو جائے گا۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ پناہ بخدا!)

یاد رکھئے! شرک، شرک ہی ہے، خواہ وہ ہر دوار میں کیا جائے یا کعبہ میں۔ حرام، حرام ہی ہے، خواہ وہ بنارس میں ہو یا مکہ میں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی رو سے کعبہ کی پوزیشن کیا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ (اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو المسجد الحرام (واجب الاحترام مسجد) کہہ کر پکارا ہے (۲۲/۲۵)۔ یعنی کعبہ ایک مسجد ہے۔

پھر کعبہ کو خدا نے اپنا گھر (بَیْتِیْ - ۲/۱۲۵) کہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر مسجد، خدا کا گھر (خانۂ خدا) کہلاتی ہے۔ "خدا کا گھر" ہونے سے یہ مطلب نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ سکونت پذیر ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات، مکان و زمان اور سمت و جہات کی تمام نسبتوں سے بلند ہے۔ اس لئے "خدا کا گھر" کہنے سے مراد یہ ہے کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی، یہ (مسجد) جس مصرف کے لئے وجود میں آئی ہے، وہ ہر ایک کا مشترک مقصد ہے۔ اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہونے چاہئیں۔ حتیٰ کہ مسجد کعبہ، مکہ کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں ہونی چاہیئے (۲۲/۲۵)۔ اس میں کسی قسم کی تفریق اور تمیز نہیں ہونی چاہیئے۔

اسلام ایک عالمگیر نظامِ انسانی قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی انسان، دنیا کے کسی حصے میں بستا ہو، اور کسی نسل یا قوم سے متعلق ہو، کوئی سی زبان بولتا ہو، جب وہ اسلامی آئیڈیالوجی (نظریۂ حیات) پر ایمان لے آئے تو وہ مسلمانوں کی عالمگیر برادری کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ اس عالمگیر نظام کا مرکز کعبہ ہے۔ یعنی

مسلمانوں کی اطاعت کا مرکز ——— خدا کی ذات۔

ان کے آئین و قوانین کا مرکز ——— خدا کی کتاب۔ اور

ان کے نظام کا مرکز محسوس ——— کعبہ

سمجھنے کے لئے یوں سمجھئے کہ جس طرح (مثلاً) جب ہم ماسکو یا لندن کہتے ہیں تو اس سے مراد دو شہر نہیں ہوتے، بلکہ دو مختلف نظامہائے تمدن و معاشرت کے مرکز ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب مکہ یا کعبہ کہا جائے گا تو اس سے مراد نظامِ خداوندی کا مرکز ہوگا۔ اس کی مرکزیت کا تقاضا ہے کہ مومن، دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنی تمام توجہات کا رُخ اسی مرکز کی طرف رکھے۔ وہی اس کے فکر و عمل کا سرچشمہ، اور افرادِ ملت کے باہمی رابطہ کا نقطۂ ماسکہ ہو۔ اس یک جہتی اور ہم آہنگی کو محسوس شکل میں تعبیر کرنے کے لئے، تمام دنیا کے مسلمان، نمازوں میں اپنا رخ اسی طرف کرتے ہیں۔ وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

قِیٰمًا کو (۵/۹۷) اور اسی مقام پر اس عالمگیر اجتماع (حج) کے لئے جمع ہوتے ہیں، جو ان کے ملی مقاصد کے لئے کشود کار کا ذریعہ ہے، اور جہاں وہ اپنے اجتماعی منافع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں (۲۲/۲۸)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہاں نہ کعبہ کی پرستش کا کوئی تصور ہے، نہ اس کے اینٹ پتھر یا لکڑی اور کپڑے کی تقدیس کا کوئی سوال۔

تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے کہا گیا کہ

طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ (۲۲/۲۶)

دوسری جگہ طائفین کے ساتھ عاکفین کہا گیا ہے۔ (۲/۱۲۵)۔ یعنی تم میرے گھر کو "طائفین اور عاکفین (یا قائمین) اور راکعین اور ساجدین" کے لئے پاک و صاف کردو۔ "پاک و صاف" کی وضاحت یہ کہہ کر کردی کہ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا (۲۲/۲۶)۔ یعنی وہاں شرک کی آلودگی نہ آنے پائے۔ یہ خالص توحید پرستوں کا مرکز ہو۔ ان آیات میں راکعین و ساجدین کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والے اور ان کی پورے طور پر اطاعت کرنے والے۔ صلوٰۃ میں رکوع و سجود، اسی قلبی کیفیت کا محسوس مظاہرہ ہوتا ہے۔

اب رہے طائفین اور عاکفین۔ سو طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں۔ اور عکف کے معنی کسی چیز کو روکنے یا رکنے کے (یہاں لفظ کا ایک معنی ہیں)۔ اس اعتبار سے، طائفین سے مراد ہوں گے وہ لوگ جو باہر سے آئیں اور عاکفین، وہ لوگ جو مکہ کے باشندے ہوں۔ انہی کو قائمین کہا گیا ہے۔ یہ دراصل سَوَآءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵)۔ کی تفسیر ہے۔ یعنی مکہ، وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا شہر (OPEN CITY) ہے۔

نیز اَلطَّائِفُ چوکیدار یا کوتوال کو کہتے ہیں۔ جو رات کو حفاظت کے لئے پہرا دے اور عَكَفَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کے لئے لڑی میں پرو دینا۔ شَعْرٌ مَعْكُوفٌ کے معنی ہیں، کنگھی کئے ہوئے، گندھے ہوئے بال۔ اسی سے عَكَفَ کے معنی ہوتے ہیں، معاملات کو درست کردینا۔ یہ دونوں لفظ امت مسلمہ کے ان فرائض کی وضاحت کرتے ہیں جن کے لئے یہ وجود میں لائی گئی ہے۔ یعنی اس امت کا فریضہ یہ ہے کہ یہ نوع انسان کی چوکیداری کرے۔ یہ پہرہ دے تاکہ انسان سکھ کی نیند سوئیں۔ اور یہ ان کے الجھے ہوئے معاملات کو درست کرے۔ حج کا اجتماع اسی مقصد کے لئے ہے کہ اس امت کے نمایندے یکجا جمع ہو کر سوچیں کہ اس مقصدِ عظیم سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا پروگرام بنانا، اور اسے کس طرح بروئے کار لانا چاہیئے۔ اس فریضہ "طائفیت" (چوکیداری) کی تمثیلی شکل (SYMBOLIC FORM)' طواف کعبہ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یعنی وہاں جمع ہونے والے، اس عمل طواف سے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تمام نوع انسان کے حقوق کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح کوتوال یا چوکیدار رات بھر گھوم کر سونے والوں کے جان اور مال کی حفاظت

کرتا ہے ——— یہ ہے طواف کعبہ سے مقصود۔

اس کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

ایسا ہی معاملہ ان اشیاء کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر خانۂ کعبہ میں پیش کرنے کے لئے لے جائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعائر اللہ (خدا پرستی کی نشانیاں) قرار دیا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ

(المائدہ ۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے شعائر کو حلال نہ کرلو، اور نہ ماہ حرام کو اور نہ ہدی کو اور نہ ان ہاروں کو جو ہدی کے گلے میں لٹکائے جاتے ہیں اور نہ بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ (الحج ۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (الحج ۳۲)

اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے، تو یہ دلوں کے تقویٰ کی نشانی ہے۔

دیکھئے، ماہ حرام کیا ہے؟ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہی تو ہے۔ مگر کعبے کی نسبت نے اسے شعائر اللہ میں داخل کر دیا۔ ہدی کے اونٹ آخر جانوروں کے سوا اور کیا ہیں؟ مگر چونکہ وہ کعبے کی طرف نذر کے طور پر لے جائے جاتے ہیں اس لئے وہ بھی شعائر اللہ میں شمار ہو گئے۔ اہل عرب قدیم زمانے میں ان اونٹوں کے گلے میں جوتوں کے ہار لٹکا دیتے تھے تاکہ دور سے ہی دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ ہدی کے اونٹ ہیں۔ یہ ہار بھی شعائر اللہ بن گئے، کیونکہ انہیں اللہ کے گھر سے نسبت نصیب ہو گئی۔ اب ان شعائر کی تعظیم و تکریم ان اشیاء کی تعظیم و تکریم نہیں بلکہ اس نسبت کی تعظیم و تکریم ہے جو انہیں اللہ کے گھر سے حاصل ہو چکی ہے۔ اُن کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ اس بات کی علامت قرار دے رہا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں

تقویٰ ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنے میں آخر کیا مشکل ہے کہ جو کپڑا کعبے پر غلاف چڑھانے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کا احترام بھی ایک کپڑے کا احترام نہیں بلکہ اس نسبت کا احترام ہے جو اسے کعبے کے ساتھ ہو گئی ہے۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ "شعائر اللہ" کہتے کسے ہیں۔ جنگ میں جو الفاظ بطور علامت (CODE WORD) استعمال ہوتے ہیں۔ یا سفر میں اپنے قافلے کو پہچاننے کے لئے جو نشان مقرر کیا جاتا ہے، انہیں عرب شِعارٌ کہتے تھے۔ اسی طرح حج میں لے جائے جانے والے جانور پر نشان لگانے کو اِشعارٌ کہتے تھے اور اس جانور کو شعیرۃٌ۔ شِعارُ الحج۔ حج کے مناسک و علامت اور آثار و اعمال کو بھی کہتے ہیں۔ ان اعمال و علامات کے مقام کو مَشْعَرٌ کہتے ہیں۔ اس کی جمع مَشَاعِرُ ہے۔ اس معنی میں شَعَائِرُ بھی آتا ہے۔

قرآن نے جو کہا ہے کہ اللہ کے شعائر کو۔ ماہ حرام کو۔ حج کی طرف لے جائے جانے والے جانوروں کو۔ ان کے گلے میں لٹکائے ہوئے ہاروں کو۔ اور بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو حلال نہ کر لو، تو اس کے مفہوم کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ عربوں کے ہاں لوٹ مار عام تھی۔ جو کچھ کسی کے ہتے چڑھ جاتا، وہ اسے اڑا کر لے جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں، نہ اطمینان سے حج کے لئے سفر کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان مسافروں کی کوئی شے محفوظ رہ سکتی تھی۔ اس مقصد کے لئے، قرآن نے ایک بین الاقوامی قانون کی رُو سے تاکیداً کہہ دیا کہ جن مہینوں میں حج کے لئے سفر کیا جاتا ہے، ان میں جنگ و جدال اور لوٹ مار ہرگز نہ کی جائے۔ اور نہ ہی حج کے لئے سفر کرنے والوں کو چھیڑا جائے۔ نہ ہی ان کے مال و اسباب اور جانوروں کو لوٹا جائے۔ یعنی ان میں سے کسی بات کو حلال (جائز) نہ سمجھا جائے۔ ان کا احترام کیا جائے۔ ان احکام کی رُو سے، حج کے لئے جو امن کی صورت پیدا ہو گئی، اس کے متعلق قرآن میں ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹/۶۷)

کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہم نے حرم کو امن والا بنا دیا ہے، حالانکہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اچک لئے جاتے ہیں۔

یہ ہے مطلب شعائر اللہ کے احترام کا۔ نہ یہ کہ ہر وہ شے جس کی نسبت کعبہ کی طرف ہو جائے، اس کے جلوس نکالے جائیں۔ اس پر پھولوں کی بارش کی جائے۔ لوگ اس کے جلو میں درود و سلام پڑھتے ہوئے مؤدبانہ انداز سے سر جھکائے ہوئے چلیں۔ راستے میں مکانوں پر لٹکائی ہوئی تصویریں الٹی کر دی جائیں۔ ریڈیو بند کر دیئے جائیں۔ اس کی زیارت سے مشرف ہونے کا ملک گیر پروگرام بنایا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کعبہ کی طرف منسوب کردہ شے کے احترام کی یہی شکل رہی تو نہ معلوم یہاں کس کس چیز کے جلوس نکلنے شروع ہو جائیں۔ ابھی سے خبریں سننے میں آ رہی ہیں کہ حریم کعبہ کے فرش کے لئے جو پتھر پاکستان سے جائیں گے، ان کے جلوس کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ اور

اسی طرح ان بجلی کے پنکھوں کی بھی شمولیت ہوگی جو یہاں سے خانۂ کعبہ اور مسجد نبویؐ کے لئے عام طور پر بھیجے جاتے ہیں یعنی ہم جسے جی چاہے شعائراللہ کی فہرست میں داخل کرتے جائیں اور پھر اس کے جلوس نکالتے رہیں۔

غلافِ کعبہ کے سلسلہ میں مودودی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ

> اسے دیکھنے کے لئے جو شخص بھی آتا ہے اسے اللہ کے گھر کی محبت کھینچ کر لاتی ہے نہ کہ ایک کپڑے کو دیکھنے کی خواہش۔ اسے بیت اللہ کی طرف بھیجنے کے لئے جو مشایعت کی جاتی ہے وہ اس شوق کا ایک مظہر ہے جو مسلمان خود بیت اللہ کی زیارت کے لئے اپنے دلوں میں پالتے ہیں۔ اس حد تک جو کچھ کیا جائے وہ تو شرک کی تعریف میں نہیں آتا۔ البتہ اس سے تجاوز کر کے اگر کوئی شخص اس غلاف کو چومے اور اس کا طواف کرے اور اس سے حاجت کرد عائیں مانگے اور اس کی طرف رُخ کر کے رکوع و سجود کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا کیونکہ یہ سب امور بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ غلاف کے کپڑے کو اللہ نے اپنا گھر قرار نہیں دیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، کعبہ کی طرف منسوب کردہ اشیاء کے متعلق احترام کا یہ تصور ہی منشائے خداوندی نہیں۔ لیکن اگر بفرضِ محال اسے درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس اصول سے مودودی صاحب بھی بے خبر نہیں ہوں گے کہ جو عمل کسی شرک کی طرف لیجانے کا ذریعہ بن جائے، اسے روکنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہماری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو "سدباب ذریعہ" کے متعلق خود ترجمان القرآن میں بڑی تفصیل سے لکھا جاتا رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی ہر ایک کو معلوم ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس درخت کے نیچے، جہاں نبی اکرمؐ نے صحابہؓ سے بیعت رضوان لی تھی، نوافل پڑھنے لگ گئے ہیں، تو آپ نے اس درخت کو کٹوا دیا تھا۔ یہ کیا تھا؟ اسی عظیم حقیقت کا احساس کہ اگرچہ آج اس عمل میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن ہو سکتا ہے کہ کل کو یہی چیز مشرکانہ عقیدت کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن جائے۔ شرک کے معاملہ میں مسلمان کو اتنی ہی احتیاط، اور اس کی نگاہ کو ایسا دوررس ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اس (شرک) سے دین کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں، ایک دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے۔ جب جماعتِ اسلامی کی ان مشرکانہ حرکات کے خلاف اعتراضات شروع ہوئے تو انہوں نے، اپنے سادہ لوح متبعین کو یہ کہہ کر فریب دینے کی کوشش کی کہ یہ اعتراضات "منکرینِ حدیث، کمیونسٹوں اور قادیانیوں" کی طرف سے کئے جا رہے ہیں، اس لئے یہ درخورِ اعتناء نہیں۔ اس کے جواب میں جمعیت اہلِ حدیث کے ترجمان، الاعتصام نے، ان علماء کے نام گنوائے جنہوں نے یہ مخالفت کی تھی اور ان لوگوں سے کہا کہ ذرا بتائیے کہ ان میں سے کون کون "منکرِ حدیث۔ کمیونسٹ۔ یا قادیانی" ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے مولانا

امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک خط بھی آیا ہے جو لائل پور سے شائع ہونے والے اخبار المنبر کی ۵ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، محترم اصلاحی صاحب، نہ صرف قریب اٹھارہ سال تک، جماعتِ اسلامی کے کارواں کے ساتھ رہے ہیں بلکہ اکثر اوقات اس قافلہ کے سالار کارواں بھی رہے ہیں۔ وہ اپنے اس خط میں لکھتے ہیں۔

محبی جناب حکیم صاحب — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

عنایت نامہ اور غلافِ کعبہ سے متعلق المنبر کا تراشہ موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس ہنگامۂ شرک و بدعت کے خلاف آپ نے بروقت آواز اٹھائی۔ اس مسئلہ پر مسلسل لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہنگامہ اٹھانے والوں کی طرف سے اس شرک و بدعت کی تائید میں جو لایعنی دلیلیں دی جا رہی ہیں ان میں سے ایک ایک کی حقیقت اچھی طرح واضح کر دیجئے۔ مجھے بہت پہلے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جماعتِ اسلامی اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتنہ بننے والی ہے۔ میرے بعض احباب کو میرے اس اندازہ سے اختلاف تھا۔ لیکن غلافِ کعبہ کی آڑ میں اس جماعت نے بدعت اور اہلِ بدعت کی حمایت میں جو تحریک چلائی ہے اس کو دیکھ کر شاید ہی اب کوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی میرے اس اندازہ کو غلط قرار دے سکے۔ اگر دین کے حامیوں نے اس موقعہ پر غفلت برتی تو مجھے ڈر ہے کہ جماعتِ اسلامی یہ نئے مبتدعین ان لوگوں کے نظریات اور عقائد بھی بگاڑ کے رکھ دیں گے جن کے عقائد و نظریات شرک و بدعت سے اب تک ملوث نہیں ہوئے تھے۔ یہ ہنگامہ اٹھانے والوں کی طرف سے ایک پمفلٹ بھی چھاپ کر بڑی سرگرمی سے فروخت کیا جا رہا ہے وہ بھی میری نظر سے گزرا ہے جس میں جو پرفریب مغالطے دیئے گئے ہیں ان کا بھی پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ پمفلٹ پڑھ کر اس ذہنی۔ اخلاقی اور ایمانی انحطاط پر مجھے بڑا صدمہ ہوا ہے جس میں اب جماعت کے کافی حضرات مبتلا ہو چکے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اب کے لائلپور سے بیمار ہو کر لوٹا جس کے سبب سے حلقہ تدبر قرآن کے سوا دوسرے لکھنے پڑھنے کے کام میں ابھی تک شروع نہیں کر سکا ہوں۔ اگر طبیعت اچھی ہوتی تو میں خود اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ لکھتا۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ اس موقع پر احقاقِ حق کا صحیح حق ادا کر سکیں۔ والسلام

امین احسن اصلاحی

شرک کو خدا نے ناقابلِ معافی جرم قرار دیا ہے۔ جماعتِ اسلامی نے اس جدید شرک کی جو طرح ڈالی ہے، اور سادہ لوح مسلمانوں کو جس طرح اس راستے پر چلایا ہے، اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے، اس سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ اس جرم کی سزا واقعی بڑی سخت ملتی ہے، انہوں نے یہ سارا کھیل، قوم میں پاپولر (مقبول) ہونے کیلئے کھیلا تھا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسی وجہ سے وہ ملک میں اس قدر بدنام ہوئے ہیں کہ ان کا برسوں کا قائم کردہ وقار خاک میں مل گیا ہے۔ کس قدر ابدی ہے یہ حقیقت کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (۴/۱۱۶) اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

رابطۂ باہمی

لندن

بزم کا ماہانہ اجتماع محترم گلزار محمد چغتائی کے دولتکدہ (20 HOWARD WALK LONDON No: 2) پر ہوا۔ اس اجتماع میں بہت سے نئے احباب نے بھی شرکت کی۔ اس بار "ثواب کیا ہے؟" کے موضوع پر پرویز صاحب کی علم افروز تقریر بذریعہ ٹیپ سامنے آئی۔ اور حاضرین کم و بیش دو گھنٹے تک علم و بصیرت کے وجد آفریں کیف میں کھوئے رہے۔ کینیا سے دو نوجوان بہن طالب علم بھی اس اجتماع میں شریک تھے اور انہوں نے برملا اعتراف کیا کہ اس قدر بصیرت افروز، دلائل و براہین سے بھرپور اور قرآنی حقائق سے پُر نور درس انہوں نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔ آیندہ ماہانہ اجتماع میں یہ احباب بہت سے نئے احباب ساتھ لا رہے ہیں۔

درس کے بعد افہام و تفہیم کی جو مجلس آراستہ ہوئی اس میں محترمہ بیگم ڈاکٹر احسن خاں اور احسن رشید صاحب نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ محترم ایم۔ وائی۔ بٹ صاحب نے ہڈرس فیلڈ (HUDDERS FIELD) اور محترم دین محمد صاحب نے بریڈ فورڈ (BRAD FORD) میں پرویز صاحب کی تقاریر کے ٹیپ سنانے کا اہتمام کیا۔ ان احباب کی رپورٹ کے مطابق ہر دو شہروں کی مسلم آبادی قدامت پرستانہ ذہن رکھتی ہے۔ اس کے باوجود قلب سلیم رکھنے والے ان احباب کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جو آیندہ درس کا بے تابی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بزم لندن سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ ماہانہ کی بجائے ان کے ہاں ہفتہ وار درس کا انتظام کیا جائے۔ بریڈ فورڈ کے مقامی اخبارات میں درس کا اعلان شائع کرانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

ہر دو شہروں میں جلدی بزموں کے قیام کی توقع ہے اور یہ دونوں شہر شمالی اور وسطی انگلستان کے لئے دعوتِ فکرِ قرآنی کے مرکز قرار پاسکیں گے۔

بزموں اور ان کے نمایندوں کیلئے

بزموں کی رکنیت کیلئے نئے فارم چھپ کر ادارہ میں آگئے ہیں۔

ہر رکن بزم کے لئے اب ضروری ہے کہ رکنیت کی تجدید کرتے ہوئے ان فارموں کو پُر کرے۔ ان کی ایک پرت بزم کے پاس رہے گی اور دوسری ادارہ میں بھیجنی ہوگی۔ اس لئے ہر جگہ جس قدر فارموں کی ضرورت ہو، اس سے ادارہ کو بلا تاخیر مطلع فرمایئے۔

ناظم ادارہ

ضروری اعلانات

۱۔ طلوعِ اسلام کنونشن کے خطابات میں سے بعض اہم خطاب ——— (مثلاً) پرویز صاحب کے خطابات "انسان کے بنیادی حقوق" اور "انسان اور جنگ"۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا خطاب "پاکستان کا مسئلہ" خان عبدالحکیم خان کا خطاب "دنیا میں جنتی زندگی" اور مولانا عبدالرب صاحب کا خطاب "گونوا ربّانیّین" ——— عدم گنجائش کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس کے لئے ہم متعلقہ احباب سے معذرت خواہ ہیں۔ انہیں طلوعِ اسلام کے اگلے شمارے میں شائع کیا جائے گا۔

۲۔ کنونشن کے ۱۳ اپریل سہ پہر کے اجلاس میں "طلباء کے مسائل" سے متعلق اردو مقالات کے علاوہ

محترمہ نسیم جہاں زیب نے "طلباء اور پاکستان" اور پروفیسر شمیم انور صاحبہ نے "طلباء اور مذہب" کے عنوان سے بہت افروز مقالے انگریزی میں پیش کئے تھے۔ ان کا رواں ترجمہ اسی اشاعت میں شامل ہے۔ لیکن اصل تقاریر انگریزی پمفلٹ کی شکل میں الگ شائع کیا گیا ہے۔ اور قیمت چار آنے فی پمفلٹ رکھی گئی ہے۔ جن حضرات کو اس پمفلٹ کے جس قدر نسخے درکار ہوں اس سے ادارہ کو مطلع فرمائیں۔ ان پمفلٹوں کا انگریزی خواں طبقہ تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔

(ناظم ادارہ)

ادارہ کے فون نمبر میں تبدیلی

نیا نمبر 80814 ہے۔ اسے نوٹ کر لیجئے

متعلقہ محکمہ نے اپنے انتظامی تقاضوں کے تحت لاہور میں اکثر فون نمبر تبدیل کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اعلان ضروری ہے کہ

ادارہ طلوع اسلام کا

نیا فون نمبر ۸۰۸۱۴ ہے

ادارہ طلوع اسلام ؛ قرآنک ریسرچ سینٹر ؛ اور پرویز صاحب سے رابطہ گفتگو قائم کرنے کے لئے

یہ نیا نمبر یاد رکھئے اور بھولئے نہیں۔

(ادارہ)

کراچی کے دوستو! آئیے۔ اور ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) میں مفکر قرآن پرویز صاحب کی زبان میں سنئے کہ قرآن عصر حاضر کے چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے زندگی کے درپیش مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

لاہور میں پرویز صاحب کا درس قرآن ہر اتوار کی صبح کو (بوقت ۹ بجے) ۲۵/بی۔ گلبرگ میں باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ (نمایندہ بزم۔ لاہور)

راولپنڈی میں پرویز صاحب کا درس قرآن ہر جمعہ کی شام کو ۴ بجے بمقام الکوثر بلڈنگ (بالمقابل گورنمنٹ گرلز کالج مری روڈ) پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے۔ (نمایندہ بزم طلوع اسلام)

طاہرہ کے نام خطوط

طاہرہ بیٹی کو گلہ تھا کہ سلیم بیٹے کے شکوک کو تو رفع کر دیا لیکن عورتوں کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے، یہ کہیں نہیں بتایا؟ ان خطوط میں یہی بتایا گیا ہے اور بڑے ہی دلآویز انداز میں بتایا گیا ہے۔

کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے

قیمت۔ حصہ اول دو روپے۔ حصہ دوم۔ دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ۔ **میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ**

۲۷/بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور